اصل دہشت گرد کون؟

گزشتہ ایک ماہ کے دوران کراچی میں پے بہ پے رونما ہونے والے دہشت گردی کے واقعات دراصل ملک وملت کے خلاف ایک نہایت گہری سازش کا حصہ ہیں۔ ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے کلمہ حق کہنے والے دینی رہنماؤں کو اپنے راستے سے ہٹانا اور مساجد اور امام بارگاہوں میں دہشت گردی کے ذریعے مسلمانوں کے مختلف مسلکی گروہوں کو باہم لڑانے کی کوشش کرنا دراصل اسلام دشمن عالمی طاقتوں کا ایجنڈا ہے جس پر وہ پوری تندہی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں اور اس طرح پاکستان کو کمزور کرنے کے درپے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں

مفتی نظام الدین شامزئی کی شہادت اور مسجد علی رضا کی شہادتوں

کے افسوسناک واقعات ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔ الحمد للہ کہ ان واقعات پر اہل سنت اور اہل تشیع کے چوٹی کے علماء ودینی رہنماؤں نے فہم وفراست اور حلم وتدبر کا ثبوت دیتے ہوئے ان واقعات کو بجا طور پر اسلام دشمن طاقتوں کی کارستانی قرار دیا ہے اور عام مسلمانوں کو صبر وتحمل کا درس دیا ہے۔

اس تناظر میں ہم صدر پرویز مشرف کو توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ وہ ان ملک دشمن طاقتوں کے دباؤ میں آکر بے جا الزامات کو تسلیم کرنے اور ان کے ''منظور نظر'' تصور اسلام کو فروغ دے کر اسلام دشمن ایجنڈے کی تکمیل میں معاون بننے کی بجائے اسلام دشمن طاقتوں کی سازشوں کو ہمت وجرأت کے ساتھ بے نقاب کریں اور عراق، فلسطین اور افغانستان کی حالیہ المناک صورتحال کے اصل ذمہ دار دنیا کی سب سے بڑی دہشت گرد طاقتوں یعنی امریکہ اور اسرائیل کے وحشیانہ و ظالمانہ اقدامات اور صریح بے انصافی اور جھوٹ پر مبنی طرز عمل کی بھرپور مذمت کریں، اور سرزمین پاکستان کو عالمی سازشوں کی آماجگاہ بننے سے روکنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اور اگر وہ (خود ان کے بقول) اس فسادزدہ دنیا (Disorderly World) میں امن وامان اور عدل وانصاف (Order) لانے کے خواہش مند ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ کائنات کے خالق ومالک کے عطا کردہ قرآن وسنت پر مبنی نظام عدل اجتماعی کو قائم کرنے پر کمربستہ ہو جائیں۔ اس طرح قوی امید ہے کہ کائنات کی عظیم ترین طاقت کی نصرت وحمایت بھی انہیں حاصل ہوگی اور دنیا میں حقیقی امن وامان کے قیام کی راہ ہموار ہوگی۔ بقول مفکر ومصور پاکستان، علامہ اقبال ؎

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں!

تنظیم اسلامی، مرکز 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔ فون: 6366638

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرۃ: ۲۶۹)

دار المطالعہ قرآن اکیڈمی
نمبر 11-6-04
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جلد ۲۳ | ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ ـ جون ۲۰۰۴ء | شمارہ ۶

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن ـ لاہور ۱۴ ـ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون: 100 روپے ' فی شمارہ: 10 روپے

ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی تحقیق کا مفہوم اور عصر حاضر میں اس کا تقاضا

گزشتہ ماہ کے حرفِ اوّل میں قارئین حکمت قرآن کو قرآن اکیڈمی لاہور میں شعبہ تحقیق اسلامی کے قیام کی اطلاع دی گئی تھی اور اس کے اغراض و مقاصد کا وہ اجمالی خاکہ بھی پیش کیا گیا تھا جو بطور ہدف اس شعبہ کے پیش نظر رہے گا۔ ''اسلامی تحقیق'' کے نام سے اگرچہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں بہت سا کام ہو رہا ہے اور اس مقصد کے لئے بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ کام کرنے والوں پر بالعموم ''اسلامی تحقیق'' کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بہت سا ایسا علمی کام جو یا تو کرنے والے کے ''مسلمان'' ہونے کی وجہ سے' اور یا نفس مضمون کے اعتبار سے ''اسلامی'' یا ''تحقیقی'' ہونے کی بنا پر ''اسلامی تحقیق'' کے تحت شمار کیا جاتا ہے' اپنی اصل میں اسلامی تحقیق کے معیار مطلوب پر پورا نہیں اترتا۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے قریباً نصف صدی قبل ''اسلامی تحقیق کا مفہوم' مدعا اور طریق کار'' کے نام سے جو کتابچہ تحریر کیا تھا اس میں اسلامی تحقیق کا مفہوم بایں الفاظ بیان کیا ہے:

''..... اسلامی تحقیق وہ تحقیق ہے جس کا موضوع ہماری ان مقدس کتابوں (قرآن و حدیث) کے مشتملات ہوں اور جس کا مقصد یہ ہو کہ ان مشتملات کو لوگوں کے لئے زیادہ قابل فہم بنایا جائے۔ اس تعریف کی روشنی میں ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی تحقیق میں کونسی چیزیں شامل ہیں اور کونسی شامل نہیں ہیں۔ مثلاً اس میں وہ سب تحریریں شامل ہوں گی جو مسلمان علماء (۱) ان مقدس کتابوں کے متعلق' یا (۲) ان کتابوں کے متعلق جو ان مقدس کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہوں' ماضی میں لکھ چکے ہیں یا آئندہ لکھیں گے.....''

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم آگے چل کر واضح کرتے ہیں کہ چونکہ ہر دور کا علمی چیلنج مختلف ہوتا ہے' لہٰذا علمائے متقدمین کی اسلامی تحقیق ہمارے زمانہ کے چیلنج کا جواب نہیں بن سکتی۔ لکھتے ہیں:

''اس زمانہ کے حکیمانہ تصورات اور نظریات جو اسلام سے ٹکراتے ہیں اور جن کی تردید پیش کرنا ہمارا فرض ہے' مثلاً ماکسزم' فرائڈزم' ایڈلرزم' میکڈوگلزم' بی ہیویرزم' لاجیکل پازیٹوزم' شپنگلرزم' ٹائنبیزم وغیرہ' جو عصر حاضر کی مخصوص علمی فضا کی پیداوار ہیں' اپنی نوعیت اور اپنے طرز استدلال کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں اور ہمارے بڑے بڑے متقدمین علماء اور فضلاء ان سے قطعی طور پر نا آشنا تھے۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ وہ اپنی کتابوں میں ان کی تردید مہیا کر چکے ہیں حد درجہ کی سادگی ہے۔ چونکہ ہم ہی ان سے واقف ہوئے ہیں' لہٰذا اسلام کی مدافعت کرنے اور اس کے علمی اور عقلی مقام کو بلند رکھنے کے لئے ان کی تردید بہم پہنچانا ہمارا ہی کام ہے.....''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ قرآن اکیڈمی کا شعبہ تحقیق اسلامی ایسے رجال کار پیدا کر سکے جو دورِ حاضر کے درپیش علمی چیلنجوں کا کماحقہ ادراک کر سکیں اور اس کا سامنا کرتے ہوئے اعلیٰ ترین علمی سطح پر ان کا جواب دے سکیں۔ ○○

منتخب نصاب (درس ۲۶)

ڈاکٹر اسرار احمد

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت

اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید

(۱۴)

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ؕ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝﴾ (آیات ۲۰ تا ۲۴) ..... صدق اللّٰہ العظیم

دنیا کی زندگی کس اعتبار سے کھیل تماشا ہے؟

سورۃ الحدید کا یہ پانچواں حصہ بھی پانچ آیات پر مشتمل ہے اور اس کی سب سے پہلی آیت بھی میرے نزدیک قرآن کریم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ میرے مشاہدے کی حد تک اس آیت کی بھی اصل حقیقت تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہو سکی ہے۔ اس لئے کہ یہاں پانچ الفاظ جس حسنِ ترتیب کے ساتھ آئے ہیں اس میں ایک بہت بڑی حکمت مضمر ہے جس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ یہ مضمون کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا ہے اور دھوکے کی ٹٹی ہے' یہ اس اعتبار سے ہے کہ اگر دنیا خود مطلوب و مقصود بن جائے اور آخرت سے غافل کر دے۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝﴾ ''دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں''۔ کوئی شخص اگر غریب الوطنی کی کیفیت یعنی حالت مسافرت میں ہو اور اپنا اصل گھر' اصل وطن اور اصل منزل بھول جائے تو معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی بدنصیب شخص ہے۔ تو دنیا اگر اس طریقے سے کسی انسان کو اپنے اندر جذب کر لے' متوجہ کر لے کہ اس کی اصل زندگی پس پردہ چلی جائے تو اس اعتبار سے دنیا کی زندگی سراسر دھوکے کا سامان ہے۔ اس مضمون کو سورۃ العنکبوت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (آیت ۶۴)

''یہ دنیا کی زندگی تو کھیل کود اور تماشے کے سوا کچھ نہیں' اصل زندگی تو آخرت کے گھر کی زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا۔''

تو اگر حیاتِ دُنیوی انسان کو آخرت سے غافل کر دے تو اس سے بڑا دھوکے کا سامان کوئی نہیں۔ اس معنی میں بہت سی جگہوں پر قرآن مجید میں یہ مضمون آیا ہے' بلکہ ''لَهْوٌ وَّلَعِبٌ'' اور ''لَعِبٌ وَّلَهْوٌ'' دونوں ترکیبوں کے ساتھ آیا ہے' لیکن جس شان سے یہاں سورۃ الحدید میں آیا ہے اور پھر اس پر جو اضافہ ہے' میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ یہ قلت تدبر ہی ہے کہ اس پر لوگوں نے غور ہی نہیں کیا کہ یہ الفاظ کس ربط کے ساتھ آ

رہے ہیں۔فرمایا: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ﴾ ان الفاظ کی ترجمانی یوں ہوگی کہ ''جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی تو بس یہی کچھ ہے کہ کھیل ہے' کچھ لذت حاصل کرنا ہے' کچھ زینت اور بناؤ سنگھار ہے' کچھ آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے اور کچھ مال اور اولاد کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش ہے''۔ یہ پانچ الفاظ جو یہاں آئے ہیں ان کو اسی ترتیب سے رکھ کر یہ مضمون بیان کیا جا سکتا ہے۔لیکن ان کی جو اصل عظمت ہے وہ اس حوالے سے ہے کہ یہ اصل میں حیاتِ انسانی کے پانچ ادوار ہیں جو اِس ترتیب سے آئے ہیں۔ ہمارے اردو یا عربی کے محاورے میں عام طور پر ''لہو ولعب'' کا لفظ آتا ہے' لیکن یہاں پر ''لَعِبٌ وَّلَھْوٌ'' کی ترکیب آئی ہے' تو یہ ویسے ہی نہیں ہے بلکہ بڑی حکمت کی حامل ہے!

انسانی زندگی کے پانچ ادوار ——— آئینہ قرآنی میں

انسانی زندگی کے پانچ ادوار ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جبکہ زندگی صرف کھیل سے عبارت ہے۔ بچپن اور لڑکپن میں کوئی فکر' تشویش اور اندیشہ نہیں' اپنے کھانے پینے کی بھی فکر نہیں' وہ والدین کے ذمہ ہے' بھوک لگے گی تو ماں کھلائے گی' پلائے گی۔ بچے کے لئے زندگی صرف کھیل ہے۔ اِلّا یہ کہ تکلیف ہوگی تو وہ رو لے گا' کوئی احتیاج ہوگی تو مُنہ بسورے گا اور والدین کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ باقی اس کو کسی اور شے کی کوئی فکر نہیں۔ یہ کھیل ابھی خالص معصومانہ کھیل ہوتا ہے' اس میں کوئی تلذّذ کا عنصر نہیں ہوتا۔ بچے کی سوچ اور سارے کے سارے فکر کا مرکز کھیل (لعب) ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ.....﴾

اس کے بعد ایک سٹیج آتی ہے جسے ''teen ager stage'' کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا نہایت خطرناک دور ہوتا ہے۔ اب یہاں کھیل صرف کھیل نہیں رہ جاتا' اس میں کچھ نہ کچھ تلذّذ (sensual gratification) شامل ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں آدمی بہت سی غلط قسم کی آوارگیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ ''لَھْو'' ہے

جو "لَعِب" کے بعد ہے۔

تیسری سٹیج ہے "زِیْنَۃٌ" یعنی بناؤ سنگھار۔ اٹھارہ سے بیس برس کے نوجوانوں اور خاص طور پر لڑکیوں کے ذہن پر جو چیز سب سے زیادہ سوار ہوتی ہے وہ فیشن ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لباس اور وضع قطع بالکل فیشن کے مطابق ہوں۔ اگر تنگ موری والی پینٹ کا رواج ہے تو کوئی نوجوان چوڑی موری والی پینٹ پہننے کو ہرگز تیار نہیں ہوگا اور اس کے برعکس چوڑے قسم کے پائنچوں والی پتلون کا رواج ہے تو وہ دوسری قسم کی پتلون نہیں پہنے گا۔ گویا کہ ان کے سارے سوچ وفکر' احساسات اور نفسیات کے اندر سب سے نمایاں شے یہی بناؤ سنگھار اور زینت ہوتی ہے۔

اس کے بعد چوتھا دور آتا ہے "تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ" کا۔ یہ دور دراصل ۲۵ سال کی عمر سے لے کر ۳۵ یا ۴۰ سال کی عمر تک کا دور ہے۔ اس میں اصل شے تفاخر ہے کہ انسان فخر میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ فخر مختلف چیزوں پر ہوتا ہے۔ فخر علم پر بھی ہوسکتا ہے' اپنے زہد وعبادت گزاری پر بھی ہوسکتا ہے اور مال ودولت پر بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے پٹھانوں کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ اگر مدمقابل کے گھر پر نئے ماڈل کی کار آ گئی ہے تو پٹھان چاہے اپنی زمین گروی رکھے یا کچھ اور کرے بہرحال اسی ماڈل یا اس سے بہتر قسم کی کار جب تک اس کے دروازے پر نہیں آئے گی اسے چین نہیں آئے گا۔ اسی طرح اپنی نسل اور عصبیت پر بھی فخر ہوسکتا ہے۔ یعنی اپنی قبائلی برتری کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ "تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ" کا دور ہے۔

چالیس برس کے بعد جب عمر ڈھلنی شروع ہوتی ہے تو "تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ" والا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اب انسان کو کثرت کی فکر ہو جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال جمع ہو جائے' بلکہ میں یہ الفاظ استعمال کیا کرتا ہوں کہ "تفاخر" کے دور میں تو آدمی مونچھ اونچی رکھتا ہے' چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ مونچھ نیچی نہیں ہونے دیتا' لیکن "تکاثر" کے دور میں آدمی سوچتا ہے کہ مونچھ چاہے مونڈھی دی جائے لیکن پیسہ ملے۔ اس کے پیش نظر اصل شے پیسہ اور دولت ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح اس کے

پاس آ جائے' چاہے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔ آدمی اس دور میں گویا بڑا حقیقت پسند (realistic) ہو جاتا ہے کہ اب بناؤ سنگھار اور تفاخر جیسی چیزوں پر کیوں خواہ مخواہ اپنی دولت ضائع کی جائے۔ بس پیسہ سنبھالو اور دولت سینت سینت کر رکھو!

یہاں قرآن مجید میں کثرت کی خواہش میں اولاد کا ذکر بھی موجود ہے۔ آج میڈیا کے گمراہ کن پروپیگنڈے کے زیر اثر کثرتِ اولاد کو باعثِ عار سمجھا جانے لگا ہے' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کثرتِ اولاد ہمیشہ فخر کی علامت رہی ہے۔ خاص طور پر جس کے جوان بیٹے ہوں اس کو یقیناً ایک تقویت حاصل ہوتی ہے۔ قبائلی زندگی میں تو دراصل انسان کی ذاتی عزت و وجاہت اسی بنیاد پر تھی۔ آج بھی دیہاتی زندگی میں یہ عنصر موجود ہے۔ میرے ایک کلاس فیلو ڈاکٹر سلیم صاحب' جو ایک ڈاکے میں قتل کر دیئے گئے تھے' مثال دیا کرتے تھے کہ باجوہ فیملی کے ایک شخص کے' جو فیصل آباد کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا' گیارہ بیٹے تھے جو سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو گئے۔ کوئی کہیں پر ڈی سی لگ گیا' کوئی کسی اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گیا' جبکہ گاؤں میں کوئی بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ وہاں پر تو اس کا مقابلہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا اور وہاں اس کے پاس کوئی بھی بیٹا نہیں تھا جو اُس کا دست و بازو بنتا اور اس کی طرف سے مدافعت کرتا۔ تو وہ کہا کرتا تھا کہ کوئی میرے گیارہ پڑھے ہوئے لے لے اور مجھے ایک اَن پڑھ دے دے۔ اس لئے کہ یہاں پر تو جس کے پاس لاٹھی ہے اس کی عزت ہے' گاؤں میں تو سر اٹھا کر وہی چل سکتا ہے جس کے جوان بیٹے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیں اور میرے بیٹے تو پڑھ لکھ کر سب کے سب چلے گئے' لہٰذا میرے لئے عزت و وجاہت کی کوئی بنیاد موجود نہیں[1]۔ یہاں خاص طور پر نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید خاص قبائلی پس منظر میں نازل ہو رہا تھا اور اس کے اوّلین مخاطب وہی تھے جن کا سارا نظام قبائلی تھا۔ آج کی دنیا میں تو ضبطِ تولید اور فیملی پلاننگ کا معاملہ ہے' لیکن فطرت سے

(۱) پنجابی زبان کا مشہور محاورہ ہے: ''ویراں باجھ نہ جوڑیاں تے پتراں باجھ نہ مان!'' یعنی بھائیوں کے بغیر جوڑی (جتھہ بندی) نہیں بنتی اور بیٹوں کے بغیر فخر کی کوئی بنیاد نہیں۔ (مرتب)

قریب تر جو معاشرہ ہوتا تھا' اور اب بھی جو ہوگا وہاں کثرت کی محبت میں مال کے ساتھ اولاد بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ چنانچہ ہمارے دیہاتوں کے اندر اب بھی ''تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔

درحقیقت ان پانچ الفاظ کے مابین جو ربط ہے وہ بڑا اہم اور حکمت پر مبنی ہے۔ اصل بات جو بتائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی تو لامحالہ ان ادوار میں سے ہو کر گزرے گی۔ بچپن بھی آئے گا' نوجوانی کا دور بھی آئے گا' جوانی اور بڑی قوت والی زندگی کا دور بھی آئے گا۔ پھر ادھیڑ عمر کے مرحلے کو بھی انسان پہنچے گا اور اسے بڑھاپا بھی آ کر رہے گا۔ ان مراحل میں سے کسی کو بھی انسان روک نہیں سکتا۔ یہ تو گویا وقت کی رفتار ہے' جس کا روکنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ اب آخرت سے اس کا تقابل کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ ﴾ ''اور آخرت میں یا تو سخت عذاب ہے اور یا پھر اللہ کی مغفرت اور خوشنودی ہے''۔ آخرت کی زندگی میں ابدی طور پر نوع انسانی کے دو حصے ہو جائیں گے' یا اللہ کی طرف سے رضوان اور مغفرت ہوگی یا شدید عذاب ہوگا۔ ﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ ''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں''۔ یہ دنیا کی زندگی کہیں تمہیں اپنے اندر گم نہ کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کو ہی مطلوب و مقصود سمجھ بیٹھو۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

دُنیوی زندگی بھرپور طریقے سے گزارنی ہے لیکن ع ''بازار سے گزرا ہوں' خریدار نہیں ہوں!'' کے مصداق اس کو مطلوب و مقصود نہیں سمجھنا۔ ایک حدیث نبویؐ ہے: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ)) [1] ''دنیا میں اس انداز سے رہو

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی ﷺ: کُن فِی الدُّنیَا ..... وسنن الترمذی' کتاب الزهد' باب ما جاء فی قصر الامل

گویا کہ اجنبی (غریب الوطن) ہو یا راہ چلتے مسافر۔'' یہ بات سامنے رہے کہ یہ تمہارا گھر اور منزل نہیں ہے' یہاں تمہیں ہمیشہ نہیں رہنا' تم راہ چلتے مسافر ہو۔ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ سخت قسم کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے جس سے آپؐ کی پیٹھ مبارک پر نشان پڑ گئے تھے۔ کسی صحابیؓ نے عرض کیا کہ حضور (ﷺ)! آپ کے لئے آرام دہ بستر کا انتظام نہ کرلیا جائے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَالِیْ وَمَا لِلدُّنْیَا' مَا اَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَهَا)) (۱) ''مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میں تو اس دنیا میں بس اس طرح ہوں جیسے کوئی سوار (گھوڑ سوار یا اونٹنی پر سوار) کسی درخت کے سائے میں رُکتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے آرام کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے (اور اپنی اصل منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے)''۔ وہ درخت اس کا گھر' وطن اور منزل نہیں ہے' وہ اسے چھوڑ کر اپنا راستہ لیتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا کو بس اتنی سی دیر کے لئے قیام گاہ سمجھو' اس سے زیادہ نہیں۔

ایک بات اور نوٹ کیجئے کہ یہاں جو پانچویں چیز ''تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' بیان کی گئی ہے' اس کی وضاحت یا تکمیل سورۃ التکاثر میں بایں الفاظ ہو رہی ہے: ﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝﴾ ''تمہیں کثرت کی محبت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ تم قبروں تک جا پہنچے''۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ انسان کے پاس چاہے دولت کے انبار ہوں اور اتنی دولت ہو کہ کئی نسلوں کے بارے میں اطمینان ہو کہ وہ آرام سے بیٹھ کر اسے کھا سکتی ہیں' لیکن پھر بھی دولت کی بہتات کی طلب ختم نہیں ہوتی۔ صاف نظر آ رہا ہوتا ہے کہ ایک شخص قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے' لیکن دولت کی حرص ختم نہیں ہوتی۔ تو یہی وہ کیفیت ہے جسے تکاثر سے موسوم کیا گیا ہے۔

نباتاتی سائیکل اور اس کی حیاتِ انسانی سے مماثلت

حیاتِ انسانی کے متذکرہ بالا پانچ ادوار کے بعد ایک بڑی پیاری تمثیل آ رہی

(۱) سنن الترمذی' کتاب الزھد' باب ما جاء فی اخذ المال بحقہ۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب الزھد' باب مثل الدنیا

ہے۔فرمایا:﴿ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ﴾''اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے' پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی' پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے''۔جس طرح انسانی زندگی کا سائیکل ہے کہ بچپن ہے' پھر نوجوانی ہے' پھر پوری طاقت اور شدت کو پہنچنا ہے' اس کے بعد ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپا ہے' اسی طرح ایک نباتاتی سائیکل چل رہا ہے۔﴿ كَمَثَلِ غَيْثٍ ﴾ ''جیسے مثال ہے بارش کی''۔﴿ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ﴾''کاشت کاروں کو اس کی نباتات بھلی لگیں''۔''كفر'' کے لغوی معنی ہیں دبا دینا' چھپا دینا اور مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ یہاں ''کفار'' سے مراد وہ اصطلاحی کافر نہیں ہیں جو اللہ یا اس کے رسولؐ یا آخرت یا قرآن کا انکار کریں' بلکہ یہاں کفار سے مراد کاشت کار ہیں۔اس لئے کہ کاشت کار بھی زمین میں بیج کو دباتا ہے کہ پھر وہاں سے کھیتی ابھرے گی اور لہلہائے گی۔سورۃ الفتح کے اخیر میں کاشت کار کے لئے ''زُرّاع'' کا لفظ آیا ہے﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ ﴾جب بارش ہوتی ہے تو کھیتی اپنی سوئی نکالتی ہے' چھوٹی چھوٹی پتیاں نمودار ہوتی ہیں تو کاشتکار کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

﴿ ثُمَّ يَهِيْجُ ﴾''پھر وہ کھیتی اپنی پوری قوت پر آتی ہے''۔ هَاجَ' يَهِيْجُ کسی چیز کے بھڑکنے' برانگیختہ ہونے اور جوش مارنے کے لئے آتا ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے''هَاجَ الدَّمُ'' (خون نے جوش مارا) اور''هَاجَ الْفَحْلُ'' (نر اونٹ جوش میں آیا' بپھر گیا)۔ اسی سے باب تفعیل میں هَيَّجَ' يُهَيِّجُ' تَهْيِيْجًا آتا ہے' جس کا مطلب ہے کسی شے کو جوش دلانا۔اور''ہیجان'' کا لفظ تو اردو میں بھی مستعمل ہے۔تو فرمایا جا رہا ہے کہ بارش ہوئی تھی تو اب بے آب و گیاہ مٹی میں سبزہ نمودار ہو گیا ہے۔پھر وہ فصل لہلہاتی ہے' پوری قوت کو آتی ہے' جوش مارتی ہے۔آگے فرمایا:﴿فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا﴾''پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئی''۔کچھ عرصے کے بعد اب وہ فصل یا گھاس زرد پڑ جائے گی۔بالفرض گیہوں کی فصل ہے تو شروع میں تو بڑا ہریالی کا منظر نظر آتا ہے' لیکن جب فصل پکنے پر

آتی ہے تو وہ زرد پڑ جاتی ہے۔ ﴿ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا﴾ ''پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے''۔ اب اگر فصل ہو تب بھی وہ کٹنے کے بعد بھس بن جاتی ہے اور اگر چراگاہ ہو تب بھی اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ چراگاہیں بھی بڑے بڑے رقبوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پورے وسطی ایشیا کے جو ہموار علاقے ہیں ان کے بڑے بڑے رقبے چراگاہوں پر مشتمل ہیں۔ یہ سطح مرتفع کی ڈھلوانیں ہوتی ہیں جن پر سب سے زیادہ قوی لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ منگولز بھی سطح مرتفع کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح ہندوستان کے اندر جو مرہٹے پائے جاتے ہیں وہ بھی سطح مرتفع دکن کے لوگ ہیں۔ ان کے ہاں یہی ہوتا تھا کہ بارش کے بعد سبزہ اُگ آتا تو اب ان کے جانور وہاں چرتے پھر رہے ہوتے اور یہ خود گھوڑوں پر سوار ہو کر پھر رہے ہوتے۔ یہی قبائل تھے کہ جب گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو پھر دنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا' وہ اٹیلا ہو یا چنگیز ہو۔ چنگیز کہاں سے چل کر کہاں پہنچا ہے! یہ تمام تاریخی حقائق ایچ جی ویلز نے بڑی خوبصورتی سے بیان کئے ہیں۔

بہر حال یہاں پر یہ دیکھئے کہ اس کے بعد وہ سبزہ بھی کچھ عرصہ کے بعد دھوپ کی وجہ سے جل جائے گا' زرد ہو جائے گا' پھر وہ بھربھرا سا ہو کر پاؤں تلے روندا جائے گا اور کچھ عرصہ کے بعد مٹی ہو کر مٹی میں مل جائے گا' اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوگا۔ گویا وہ سبزہ' ہریالی اور تروتازگی ختم ہوئی' اور معلوم ہوا کہ وہی سبزہ اب خاک بن کر اڑ رہا ہے۔ اب وہاں پھر وہی ویرانی ہے اور ریگزار کا ایک منظر ہے۔ چونکہ قرآن مجید کے اوّلین مخاطبین عرب تھے لہٰذا یہ عرب کا پورا کا پورا پس منظر واضح ہو گیا۔ تو جیسے اس دنیا میں چند مہینوں کا نباتاتی سائیکل ہے کہ باقاعدہ بیج ڈالا' فصل تیار ہوئی' اب کٹنے کے بعد اُس کے تنکے ہوا میں اڑتے پھر رہے ہیں' بعینہٖ انسانی زندگی کا ایک سائیکل ہے۔ جس گھر میں بھی کوئی نئی ولادت ہوتی ہے' بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشی کے شادیانے بجائے جاتے ہیں۔ پھر وہ بچہ بڑا ہوتا ہے' پھر اس میں طاقت آتی ہے' وہ جوانی کو پہنچتا ہے' اب اس کی امنگیں ہیں' اس کے ولولے ہیں۔ اس میں تفاخر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کی ایک ڈھلوان آتی ہے۔ اب چہرے پر بھی زردی آتی ہے' چہرے پر جھریاں پڑ رہی ہیں' بال

اب سیاہ نہیں رہے بلکہ سفید ہو رہے ہیں۔ آخر کار بڑھاپا آتا ہے' پھر موت آتی ہے اور وہ قبر میں اتار دیا جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد مٹی ہو کر مٹی میں مل جاتا ہے۔

نباتاتی سائیکل (Botanical Cycle) اور انسانی زندگی کا سائیکل (Human life Cycle) دونوں میں بڑی گہری مناسبت ہے' اور اس آیت کریمہ کا جو اصل معنوی حسن ہے وہ اسی میں مضمر ہے۔ یہ انسانی زندگی کے مختلف مراحل ہیں جن سے ہر کسی کو گزرنا ہے۔ یہ ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے' بادشاہ کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور فقیر کے ساتھ بھی۔ محلوں میں رہنے والوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور جھونپڑیوں والوں کے ساتھ بھی۔ فقیروں اور گداگروں کی زندگی بھی بالآخر ختم ہوگی' وہ بھی مٹی میں مل کر مٹی ہوں گے اور بادشاہوں اور محلات میں رہنے والوں کی زندگی بھی ختم ہوگی اور یہ بھی مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے۔

لیکن آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ﴾ ''اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور (یا پھر) اللہ کی رحمت اور رضامندی ہے''۔ آخرت میں دوام اور مستقل زندگی ہے۔ وہاں یا تو عذاب ہے بہت سخت اور یا پھر دوسری شکل ہے کہ اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضا ہے۔ ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ ''اور دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کے سامان کے کچھ نہیں ہے''۔ البتہ یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے رہے کہ دنیا اس اعتبار سے تو دھوکے کا سامان ہے اگر یہ آپ کو آخرت سے غافل کر دے' لیکن اگر خوش قسمتی سے آخرت آپ کی منزل و مقصود کے طور پر مستحضر رہے تو دنیا کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے' اس لئے کہ اسی سے آخرت بنانی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ)) ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔'' یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے۔ یہاں اگر بویا ہی کچھ نہیں تو وہاں کاٹو گے کیا! فصل کہاں سے ملے گی؟ اس اعتبار سے زندگی بہت قیمتی شے ہے۔ یہ liability نہیں ہے' بہت بڑا اثاثہ ہے' لیکن اس حوالے سے کہ اگر آخرت سامنے رہے اور مقصود و مطلوب وہی ہو۔ اور اگر اس دنیا نے انسان کو غافل کر دیا' اپنے اندر گم

کرلیا تو پھر یہ دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔ مؤمنوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ رہتے تو اس دُنیا میں ہیں' لیکن دنیا کے باسی نہیں ہیں' دنیا کے طالب نہیں ہیں' دنیا ان کے علم کا مبلغ نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہماری منزل تو آخرت ہے' ہم وہاں جا رہے ہیں۔ یہ تو ایک عارضی سفر ہے' عارضی قیام گاہ ہے۔ اگر یہ کیفیت ہے تو دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے' اس سے اگر صحیح استفادہ کیا جائے تو اسے ''امر'' بنایا جا سکتا ہے۔

مسابقت الی الجنّۃ کی دعوت

اب اگر یہ حقیقت واضح ہوگئی تو فرمایا: ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے ربّ کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے''۔ ''سَابِقُوْا'' باب مفاعلہ سے ہے جس کا مطلب ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا۔ یہ لفظ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ تم دنیا کے طالب بن جاتے ہو تو دنیا میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہو۔ ﴿تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ﴾ والا نقشہ ہوتا ہے۔ اب اگر آخرت منزل مقصود بن گئی تو اس کے لئے بھی دوڑ لگاؤ۔ اس کے لئے بھی ایک دوسرے سے آگے نکلو۔ یہ نہ ہو کہ دنیا کے لئے تو تمہارے اندر جوش و خروش اور حرکت ہے' مگر آخرت کہنے کی حد تک تو مطلوب و مقصود ہے' لیکن اس کی طرف سے بڑی قناعت ہے' اس کے لئے کوئی بھاگ دوڑ اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں ہے۔ مسابقت کا جذبہ فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے۔ ایڈلر نے کہا ہے کہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی خواہش (The urge to dominate) ایک فطری جذبہ ہے۔ انسان کے اندر مسابقت کا جذبہ موجود ہے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آپ اس کے میدانِ کار کو بدل دیجئے۔ مسابقت مال و دولت میں نہ کیجئے' بلکہ خیرات میں کیجئے۔ سورۃ البقرۃ میں بھی یہ مضمون آیا ہے: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ ''ہر ایک شخص کا کوئی نہ کوئی ہدف مقرر ہے جس کی طرف وہ پیش قدمی کر رہا ہے' تو (اے

مسلمانو!) تم نیکیوں کے لئے مسابقت کرو!'' تمہاری مسابقت اور استباق کا مرکز خیرات وحسنات' نیکیاں' بھلائیاں اور انصاف ہو۔ تم جہاد فی سبیل اللہ میں آگے سے آگے بڑھ کر سرفروشی کرو' ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ تو دین کے معاملے میں یہ مسابقت ناپسندیدہ شے نہیں ہے' بلکہ قابل تعریف ہے۔

اس مسابقت کی مثالیں ہمیں صحابہ کرام ؓ میں ملتی ہیں۔ حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ دین کے لئے بڑا کڑا وقت آ گیا ہے' اب جو کچھ بھی لا سکتے ہو لاؤ' پیسے اور مال کی اشد ضرورت ہے' اس لئے کہ اسلحہ فراہم کرنا ہے' سواریوں اور زادِ راہ کا بندوبست کرنا ہے' تو اتفاقاً اُس وقت میرے پاس بہت دولت تھی۔ [''اتفاقاً'' کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ مہاجرین سب کے سب تاجر تھے اور تاجر کے پاس کبھی کبھار ہی نقد رقم موجود ہوتی ہے' ورنہ تو سارا مال تجارت میں ہی invest رہتا ہے۔] حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ اس موقع پر تو میں حضرت ابوبکر ؓ سے بازی لے ہی جاؤں گا۔ میں نے اپنے سارے اثاثے کے دو حصے کئے اور ایک حصہ لا کر حضور ﷺ کے قدموں میں حاضر کر دیا۔ لیکن حضرت ابوبکر ؓ جو کچھ لائے تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ عرض کیا کچھ نہیں چھوڑا' جو کچھ تھا لے آیا ہوں۔ ع ''صِدّیق'' کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس!''۔ تو حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں اُس روز میں نے جان لیا کہ ابوبکر صدیق ؓ سے آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔ نوٹ کر لیجئے یہاں پر کمیت (Quantity) کا اعتبار نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ اپنے گھر کا کُل کا کُل مال لے آئے اور حضرت عمر ؓ اپنے سارے مال کا نصف لے آئے۔ یہاں یہ تفصیل زیر بحث نہیں کہ کمیت کے اعتبار سے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا مال کتنا تھا اور حضرت عمر ؓ کا مال کتنا تھا۔ لیکن کیفیت کے اعتبار سے حضرت صدیق اکبرؓ حضرت عمرؓ سے آگے بڑھ گئے' اس لئے کہ نصف تو بہر حال نصف ہوتا ہے' وہ کُل کے برابر تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اس تفصیل کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرام ؓ میں بھی

مسابقت کا جذبہ تھا جو اِس واقعہ سے ظاہر ہو رہا ہے' لیکن وہ مسابقت فی الخیرات تھی۔ لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس ضمن میں نہایت سنہرا اصول یہ ہے کہ: ''دنیا کے معاملے میں اس کو دیکھا کرو جو تم سے پیچھے ہو' اور دین کے معاملے میں اس پر نگاہ رکھو جو تم سے آگے ہو''۔ اس لئے کہ دین میں اپنے سے آگے والے کو دیکھنے سے دل میں عمل کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ابھرے گا کہ یہ آدمی اگر اتنا کچھ کر رہا ہے تو میں بھی کر سکتا ہوں' وہ بھی تو میری طرح کا انسان ہے۔ اور جو دین میں خود سے پیچھے ہے اس کو دیکھنے سے آدمی سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں بہت ہے' اس لئے کہ اس نے تو یہ بھی نہیں کیا' تو اس سے دین میں ترقی رک جائے گی۔ اس کے برعکس دنیاداری میں آگے والے کو دیکھنے سے جذبہ ابھرے گا کہ آپ دنیا کمانے کے لئے مزید محنت کریں اور پیچھے والے کو دیکھنے سے قناعت پیدا ہوگی کہ آخر اس کا بھی تو ان آسائشات کے بغیر گزارا ہو رہا ہے' آخر وہ بھی تو اسی دنیا میں رہ رہا ہے' تو اتنی محنت کر کے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو دنیا کے لئے قناعت چاہئے۔ جیسا کہ مرزا عبدالقادر بیدل کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ در کارِ حیات آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست!

یعنی اے بیدلؔ! یہ تو محض ہماری حرص ہے کہ ہمارے پاس یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو' یہ بھی ضروری ہے اور وہ بھی ضروری ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ہم جن چیزوں کو زندگی گزارنے کے لئے لازمی سمجھتے ہیں ان میں اکثریت ایسی چیزوں کی ہے کہ جو حقیقت میں درکار نہیں ہوتیں۔ تو دنیا میں اس کو دیکھو جو تم سے پیچھے ہے' تاکہ جو بھی تمہیں حاصل ہے اس پر قناعت پیدا ہو اور اللہ کے شکر کا جذبہ ابھرے۔ اور دین میں اس کو دیکھو جو تم سے آگے ہے' تاکہ تمہارے اندر بھی آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو۔[1] تو یہاں فرمایا جا رہا

(۱) اس ضمن میں یہ حدیث نبوی بھی بہت پیاری اور سبق آموز ہے کہ: "اِذَا نَظَرَ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْهِ فِی الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ" (متفق علیہ) یعنی ''جب تم میں سے کسی کی نظر ایسے شخص پر پڑے جس پر اللہ کا فضل مال اور جسم میں تم سے زیادہ ہوا ہے تو اسے چاہئے کہ ایسے شخص کو بھی دیکھے جو (ان چیزوں میں) اس سے نیچے ہو''۔

ہے ''اس جنت کے حصول کے لئے دوڑ لگاؤ جس کا پھیلاؤ' جس کی پہنائی آسمان اور زمین جتنی ہے''۔ یہی مضمون سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ (آیت ۱۳۳) ''دوڑو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کے برابر ہے''۔

ان دونوں آیات میں لفظ ''عرض'' آیا ہے' اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اردو زبان میں ہم عرض' طول کے مقابلے میں استعمال کرتے ہیں اور عرض کم ہوتا ہے اور طول زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں ''عرض'' کسی شے کی مجرد وسعت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر الفاظ آئے ہیں: ﴿ذُوْ دُعَاءٍ عَرِيْضٍ﴾ ''لمبی لمبی دعائیں کرنے والا''۔ (حم السجدۃ: ۵۱) یعنی جب انسان کو کوئی تکلیف آتی ہے تو بڑی لمبی چوڑی دعائیں مانگنا شروع کر دیتا ہے اور جب ہماری طرف سے نعمت مل جاتی ہے تو ہمیں بھول جاتا ہے' اسے یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ کبھی وہ اپنے پروردگار کو پکارتا بھی تھا' کبھی اس سے دعائیں بھی کرتا تھا۔ تو آدمی جب احتیاج میں ہوتا ہے تو اللہ کو پکارتا ہے۔ تو یہاں عرض سے پھیلاؤ مراد ہے کہ تم جنت کا تصور کر ہی نہیں سکتے۔ قرآن مجید سائنس اور فلسفے کی اصطلاحات استعمال نہیں کرتا' بلکہ عام انسانی ذہن کی سطح کے برابر آ کر بات کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں قرآن نے کائنات کی وسعت کے لئے بھی آسمان اور زمین کے الفاظ استعمال کئے ہیں' اس لئے کہ کائنات کے بارے میں ہمارا کل تصور یہی ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جنت کتنی بڑی ہوگی تم اس کا تصور نہیں کر سکتے' تمہارا تو اپنا ذہن بھی بہت مختصر ہے۔ آج کے ترقی یافتہ اور سائنسی دور کے انسان کو بھی ابھی کچھ پتا نہیں کہ یہ کائنات کتنی طویل و عریض ہے' کہاں سے شروع ہو رہی ہے اور کہاں ختم ہو رہی ہے۔ ٹیلی سکوپ جتنی بڑی ہوتی جا رہی ہے کائنات بھی اتنی ہی مزید پھیلتی نظر آ رہی ہے۔ بہرحال کسی ٹیلی سکوپ نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ اس جگہ پر کائنات ختم ہوتی ہے اور وہاں تک ہماری رسائی ہوگئی ہے۔ تو

اس اعتبار سے قرآن مجید وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جسے عرب کا عام بدو بھی سمجھ لے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ کہ اس جنت کی پہنائی اور وسعت تم کیا سمجھو گے؟ بس یوں سمجھو آسمانوں اور زمین جتنی۔

دخولِ جنت کے لئے کیسا ایمان درکار ہے؟

آگے فرمایا: ﴿اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ ''یہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اللہ پر اور ان کے رسولوں پر''۔ اَعَدَّ (باب افعال) کسی شے کو اہتمام کے ساتھ تیار کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ جنت فراہم کی گئی ہے' تیار کی گئی ہے' سنواری گئی ہے' پورے طریقے سے اس کو بنایا گیا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اب یہاں نوٹ کر لیجئے کہ سورۃ الحدید کی اس آیت میں نبھی اور انیسویں آیت میں بھی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے آگے کسی شے کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ انیسویں آیت میں سلوکِ قرآنی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر' وہی صدیقین ہیں''۔ اس میں نہ تو انفاق کا تذکرہ ہے' نہ قتال کا اور نہ ہی اعمالِ صالحہ کا۔ لیکن مراد یہ ہے کہ جب واقعتاً حقیقی معنی میں ایمان موجود ہو گا تو یہ اعمال بھی لازماً موجود ہوں گے۔ یہ گویا کہ از خود وہاں پر مندرج ہیں' understood ہیں۔ اس ایمان کے ساتھ انفاق بھی ہو گا' جہاد بھی ہو گا' قتال بھی ہو گا' اعمالِ صالحہ بھی ہوں گے' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ یہ سب کچھ ہوں گے۔ لہٰذا یہاں پر یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ مجرد ایمان کی بات ہو رہی ہے۔ تو یہاں مراد یہ ہے کہ یہ جنت تیار کی گئی ہے' اس کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر حقیقتاً ایمان رکھنے والے ہوں گے۔

محض اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخلہ ممکن نہیں

آگے ارشاد ہے: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہے گا دے گا''۔ ''فضل'' سے مراد ہے اللہ کی طرف سے بغیر استحقاق کے

دی جانے والی شے۔ اس کے بالمقابل اجرت اور اجر کے الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں جو باہم مترادفات ہیں اور ان کا مطلب ہے بدلہ' جو کسی محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں جہاں بھی جنت کا تذکرہ آیا ہے وہاں ''فضل'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ گویا قرآن مجید کا تصور یہی ہے کہ انسان مجرد اپنے عمل کے ذریعے سے جنت کا مستحق نہیں بن سکتا' جب تک کہ فضل خداوندی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اس بارے میں ایک بڑی پیاری حدیث ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَنْ یُّدْخِلَ اَحَدًا مِّنْکُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ)) قَالُوْا: وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ مِنْهُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَةٍ)) (۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کسی کا عمل بھی اسے جنت میں داخل نہیں کر سکے گا''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیا آپ کو بھی نہیں یارسول اللہ ﷺ؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں مجھے بھی نہیں' اِلّا یہ کہ مجھے اللہ اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے''۔

اللہ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے گا تو جنت میں میرا داخلہ ہوگا۔ یہ ایک اضافی بات ہے جو حضور ﷺ نے اپنے بارے میں بھی فرما دی' لیکن دراصل بات یہ سمجھانی مقصود ہے کہ کبھی بھی جنت کو اپنا استحقاق نہ سمجھئے' اپنی امکانی حد تک کام کر کے پھر بھی فضل خداوندی کا ہی سہارا لیجئے۔ قرآن مجید میں اہل جنت کا ترانہ نقل ہوا ہے' جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ﴾ (الاعراف:۴۳) ''اُس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے' اور ہم یہاں نہ پہنچ پاتے اگر اللہ ہی ہمیں نہ پہنچاتا''۔ تو لفظ ''فضل'' کے حوالے سے اس بات کو نوٹ کر لینا چاہئے۔ آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾ ''اللہ بہت بڑے فضل کا مالک ہے''۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب المرضی' باب تمنی المریض الموت۔ وصحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب لن یدخل احد الجنة بل برحمة الله تعالٰی۔

ہر مصیبت اللہ کی جانب سے ہے

اب اگلی آیات میں جو مضمون آ رہا ہے یہ اس سے پہلے سورۃ التغابن میں بڑی وضاحت سے آ چکا ہے۔ یہاں اگرچہ لفظاً زیادہ تفصیل ہے' لیکن وہاں کم الفاظ میں معناً یہ بات آ چکی ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں انسان مختلف حوادث اور آفاتِ ارضی و سماوی سے بہت متاثر ہوتا ہے' جو بسا اوقات بڑے پیمانے پر آ جاتی ہیں۔ کبھی زلزلہ آ جاتا ہے تو ہزاروں انسان اس میں ختم ہو جاتے ہیں' مکانات دھنس جاتے ہیں' یا سیلاب آتا ہے تو بڑے پیمانے پر لوگ ڈوب جاتے ہیں' ان کے گھر ختم ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے رقبے پر کھڑی فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں' یا انسان کے اپنے اندر بیٹھے بٹھائے اچانک کوئی بیماری جنم لے لیتی ہے جبکہ اسے اس کا کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ کینسر ہے یا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی شریانیں اتنے فیصد blocked ہیں۔ بعض اوقات انسان بیٹھے بٹھائے کسی مقدمے میں پھنس جاتا ہے۔ اب ان چیزوں کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ﴾ ''نہیں نازل ہوتی کوئی نازل ہونے والی زمین میں اور نہ تمہارے اپنے نفسوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں''۔ یہاں پر لفظ ''مُصِيْبَة'' کی لغوی تشریح سمجھ لیجئے! اَصَابَ' يُصِيْبُ (آ پڑنا' نازل ہونا) سے اسم الفاعل مُصِيْب ہے اور اس کی مؤنث مُصِيْبَة ہے' جس کے معنی ہیں نازل ہونے والی شے' آ پڑنے والی شے۔ یعنی جو بھی کوئی کیفیت آپ پر یا مجھ پر وارد ہوتی ہے' چاہے وہ اچھی ہو چاہے بری ہو' چاہے تکلیف دہ ہو' چاہے مسرت بخش ہو اُس پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ گویا جہاں تک اس لفظ کا لغوی تعلق ہے تمام حوادث' واقعات' کیفیات جو ہم پر وارد ہوتی ہیں' وہ سب کی سب اس میں شامل ہو جائیں گی' لیکن عام طور پر یہ لفظ تکلیف دہ' ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت میں ﴿فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ کے الفاظ لا کر مصائب کی

بھی تقسیم کردی گئی ہے۔ مصیبتیں دو قسم کی ہیں۔ یا تو سماوی یا آفاقی مصیبتیں ہیں جو زمین پر بڑے پیمانے پر نازل ہوتی ہیں یا انسان کی اپنی جانوں میں کوئی مصیبت آن پڑتی ہے' مثلاً کوئی بیماری یا کوئی اور عارضہ لاحق ہوگیا ہے' آدمی کا کوئی عضو کٹ گیا ہے یا کوئی اور حادثہ پیش آ گیا ہے۔ تو فرمایا: ﴿اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۚ﴾ ''مگر وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں'' اس کو وجود میں لائیں' اس کو خلعتِ وجود سے سرفراز کریں۔

تخلیق اور ظہورِ تخلیق کا فرق

اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں فلسفۂ وجود سے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے' البتہ اس آیت میں وارد لفظ ''نَبْرَأَ'' کے حوالے سے بات سمجھ لینی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک اسم گرامی ''الباریٔ'' ہے' جیسے کہ سورۃ الحشر کی آخری آیت میں اسماءِ حسنیٰ بیان ہوئے: ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ ''بارئ'' کے مفہوم کو سمجھنے سے پہلے لفظ ''خالق'' کو سمجھ لینا چاہئے۔ عام طور پر جب لفظ ''خالق'' کے ساتھ لفظ ''بارئ'' آتا ہے تو اکثر لوگوں نے اس کا یہ نقشہ پیش کیا ہے کہ خلق کہتے ہیں ذہنی طور پر کسی شے کی منصوبہ بندی اور نقشہ بندی کرنے کو اور برأ کا مطلب ہے اُس شے کو ایک ظاہری شکل عطا کر دینا۔ ہماری انسانی تخلیق میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔ کوئی مصور پہلے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بناتا ہے' پھر اسے صفحۂ قرطاس یا کینوس پر لاتا ہے۔ کوئی موجد ہے تو اس کے ذہن میں بھی پہلے اس ایجاد کا تصور آتا ہے' پھر عملاً یہ شے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ بارئ کے لفظ میں اصولی طور پر یہ بات موجود ہے۔ بَرَءَ' یَبْرَءُ کا لغوی معنی ہے کسی شے سے علیحدہ ہو جانا۔ اسی سے براءت اور تبرّأ وغیرہ الفاظ بنے ہیں جن کا یہی مطلب ہے کہ علیحدہ ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے بارے میں بھی فلاسفہ نے یہی دو مراحل بیان کئے ہیں کہ ایک ہے کسی شے کا وجودِ علمی جو اللہ کی ہستی اور اس کے علم میں تھا' وہ شے ہمیشہ سے اللہ کے علم میں تھی' بس اس کا خارجی وجود نہیں تھا۔ اب وہ خارجی طور پر وجود میں آتی ہے تو یہ ہے بَرَءَ' یَبْرَءُ اور اس کے حوالے سے

اللہ تعالیٰ اَلْبَارِئ ہے۔ جو بھی حوادث اس کائنات میں آنے والے ہیں علم خداوندی میں تو پہلے سے موجود ہیں۔ وہ ''عَالِمُ مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ'' ہے۔ جو ہوا ہے اور جو ہونا ہے سب اس کے علم میں ہے۔ تو جہاں تک کسی شے کے وجودِ علمی کا تعلق ہے تو ہر شے ہمیشہ سے اللہ کے علم میں ہے۔ جیسے اللہ کی ذات قدیم ہے ایسے ہی اس کی صفات اور اس کا علم بھی قدیم ہے۔ ہر شے کا ایک وجودِ علمی اللہ کی ذات کے ساتھ پہلے سے قائم تھا۔ اس کو کہا گیا: ﴿اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ﴾ کتاب سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا علم۔ تو اللہ کے علم میں وہ شے پہلے سے موجود تھی۔ آگے الفاظ آ رہے ہیں: ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ ''اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کر دیں''۔ اب گویا کہ وہ شے وجودِ علمی سے وجودِ خارجی میں منتقل ہو رہی ہے۔

علامہ اقبال کا ایک بہت اونچا شعر ہے' البتہ اس پر بہت زیادہ قیاس نہ کیجئے گا۔ فرمایا:

بضمیرت آرمیدم تو بہ جوشِ خود نمائی
بہ کنارہ برفگندی دُرِ آبدارِ خود را!

یعنی اے اللہ! میں تو تیرے وجود کے اندر بڑے آرام سے تھا۔ یعنی علامہ اقبال جو ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے یا اس سے بھی نو مہینے پہلے ان کی والدہ محترمہ کے رحم کے اندر ان کا جو استقرارِ حمل ہوا اس سے لاکھوں کروڑوں سال پہلے بھی تو ان کا وجود اللہ کے علم میں تھا' تو اس اعتبار سے وہ کہہ رہے ہیں کہ میں تیرے وجود کے اندر یعنی تیرے علم میں بڑے آرام میں تھا۔ مجھے تو کوئی چِنتا' کوئی تشویس' کوئی فکر نہیں تھی' تو نے خود ہی اپنی خلاقی کے ظہور کے لئے مجھے اپنے وجود سے باہر کیا۔

یہاں علامہ اقبال بڑی پیاری تمثیل لائے ہیں کہ سیپی کے اندر موتی پروان چڑھ رہا ہوتا ہے' جب موتی بن جاتا ہے تو سیپی از خود کھلتی ہے اور موتی کو باہر پھینک دیتی ہے۔ گویا کہ اس کے وجود میں جو قیمتی شے پروان چڑھ رہی تھی وہ تو ظہور چاہتی ہے' اگر سیپی کے اندر ہی وہ موتی گم رہے تو ظاہر بات ہے اس کا حسن کس نے دیکھا۔ جنگل میں

مورنا چاکس نے دیکھا! اس سیپی کے اندر اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی موتی پڑا ہوا ہے تو اسے کس نے دیکھا! کون اس کے حسن کی تعریف کرے گا؟ تو سیپی خود کھلتی ہے اور اس میں سے وہ موتی باہر نکلتا ہے جس کو پھر ہمارے غوّاص (غوطہ خور) سمندر کی تہہ سے نکال لاتے ہیں۔ تو اقبال اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہیں کہ تو نے خود ہی سیپی کی طرح مجھے اپنے وجود سے باہر کیا' یعنی مجھے یہ مادی وجود عطا کیا جو اس وقت میں علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ولد شیخ نور محمد کے نام سے دنیا میں ہوں۔ اصل میں اقبال یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلاقی کے ظہور کے لئے اس کائنات کو پیدا کیا۔ تو اس پورے فلسفے کو سمجھ لینے سے لفظ بَرَءَ کے حوالے سے یہ پوری حقیقت واضح ہو جائے گی۔ بدقسمتی سے ان چیزوں پر غور کا حق ادا نہیں کیا گیا۔

﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ ''یہ چیز اللہ کے لئے بڑی آسان ہے''۔ یہ تمہیں تو بڑی مشکل بات معلوم ہوگی کہ یہ ساری چیزیں ہی کسی کے علم میں موجود ہوں' لیکن یہ اللہ کی بات ہو رہی ہے۔ تم جس طرح اللہ کے وجود اور ذات کو نہیں سمجھ سکتے اسی طرح اس کی صفات کی کیفیت اور کمیت کو بھی نہیں جان سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت اور کمیت دونوں ہمارے احاطۂ ذہنی سے خارج ہیں۔

ہر حال میں مطلوب طرزِ عمل —— تسلیم و رضا

آگے فرمایا: ﴿لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ﴾ ''تا کہ تم افسوس نہ کرو اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے''۔ اللہ کی طرف سے جو حوادث سامنے آتے ہیں وہ امتحان کے لئے ہیں۔ تکلیف آ جائے تو صبر کرو' اللہ کچھ دے دے تو اس کا شکر کرو۔ فوت ہو جانا اردو میں بھی مستعمل ہے۔ یہاں فوت ہونا اس معنی میں ہے کہ کوئی موقع تھا جو ہاتھ سے نکل گیا' کوئی اور شے تھی جو آپ کے ہاتھ سے جاتی رہی' آپ کا کوئی عزیز فوت ہو گیا' آپ کا کوئی بچہ آپ کے سامنے دم توڑ رہا ہے اور آپ بہرحال اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ سورۃ الواقعۃ میں ارشاد ہوا: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴾ ''اور ہم تمہاری نسبت اس (فوت ہونے والے) کے زیادہ قریب

ہوتے ہیں مگر تم دیکھ نہیں پاتے''۔ تمہاری نگاہوں کے سامنے سے ہم تمہارے محبوبوں کو لے جاتے ہیں اور تم کچھ نہیں کر سکتے' بس دیکھ رہے ہوتے ہو۔ تو کوئی شخص یا چیز فوت ہو جائے تو اس پر بھی افسوس نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ وہ شے گئی کہاں ہے؟ اسی کائنات میں ہے۔ بس اس کی حالت تبدیل ہوئی ہے اور اللہ نے تمہارے امتحان کے لئے ایک صورت پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ﴾ ''اور جو کچھ اللہ دے دے اس پر اترایا مت کرو''۔ اس لئے کہ یہ بھی امتحان کے لئے ہی ہے' یہ بھی بغرضِ آزمائش ہے۔ اگر اس نے تمہیں دولت دی ہے تو اس کا حساب بھی تو تمہیں دینا ہوگا۔ جس کے پاس دولت زیادہ ہے اس کا حساب بھی بہت بھاری ہو جائے گا۔ جیسے دولت مندوں کو انکم ٹیکس کی زیادہ فکر ہوتی ہے' جو شخص hand to mouth ہے اس سے انکم ٹیکس کے کسی افسر کو کیا سروکار! تو وہاں جب حساب دینا ہوگا تو پتہ چلے گا کہ ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہے۔ اسی لئے بیلنس شیٹ جب بنتی ہے تو سرمائے کو liabilities کے کھاتے میں ڈالتے ہیں کہ تمہیں اس کا حساب دینا ہے کہ اسے کن کن مدات میں خرچ کیا اور اس کے ذریعے کمایا کیا؟ اس حوالے سے ایک بہت پیاری حدیث ہے جس میں پانچ سوالوں کا تذکرہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَ أَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَ أَبْلَاهُ وَمَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيْمَ أَنْفَقَهُ وَمَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ؟))(۱)

''ابنِ آدم کے قدم قیامت کے روز اپنے ربّ کے حضور ہرگز نہیں ہل سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کن کاموں میں کھپائی' اور (خاص طور پر) اس کی جوانی کے بارے میں کہ کن کاموں میں گلائی اور اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کن جگہوں پر خرچ کیا' اور یہ کہ علم کے مطابق کتنا عمل کیا۔''

تو معلوم ہوا کہ جو چیز اللہ دے دے اس پر اِترا ؤ مت! اور جو اللہ چھین لے اس پر غم و

(۱) سنن الترمذی' کتاب صفة القيامة والرقائق والورع' باب ما جاء في شان الحساب والقصاص

افسوس نہ کرو! مؤمن کی کیفیت تو وہ ہونی چاہئے جیسے سورۃ التغابن میں بیان کیا گیا ہے: ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ﴾ ''نہیں آن پڑتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے حکم سے' اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔'' یعنی تسلیم و رضا کی ہدایت کہ اللہ کی مرضی یہی تھی' اللہ کا فیصلہ یہی تھا۔ مؤمن مطمئن رہتا ہے کہ اسی میں میرے لئے خیر ہوگا' چاہے وہ خیر مجھے نظر آئے یا نہ آئے!

(نوٹ: اس آیت پر گفتگو اگلی نشست میں جاری رہے گی)

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

القاسم اکیڈمی کی عظیم تاریخی اور انقلابی پیشکش

اگیسویں صدی کی پہلی جنگ' معرکہ صلیب و طالبان

صلیبی دہشت گردی اور عالم اسلام

طالبانِ افغانستان کے تناظر میں

جہادِ افغانستان' تحریکِ طالبان' ملا محمد عمر' اسامہ بن لادن' جہاد اور دہشت گردی' نظامِ شریعت سے مغرب کا بے جا خوف' دینی مدارس بالخصوص دارالعلوم حقانیہ' اسلام کے بارے میں مغرب کی لاعلمی اور غلط فہمیاں' امریکی اور مغربی دنیا کے عزائم اور مسلم امۃ پر جارحانہ یلغار' سقوط بغداد' مسئلہ فلسطین و کشمیر اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیت جیسے اہم و حساس قومی و بین الاقوامی موضوعات کے تناظر میں عالمی اور مغربی میڈیا سے

مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کا دوٹوک مکالمہ

مرتب: مولانا عبدالقیوم حقانی

صفحات: 520 قیمت: 240 روپے

القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ' خالق آباد' ضلع نوشہرہ' سرحد پاکستان

قسط وار سلسلہ

نباتاتِ قرآن

تحریر: سید قاسم محمود

ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ اردو زبان میں ہمارے دانشوروں نے قرآنی آیات کی روشنی میں اجرامِ فلکی اور طبعی کائنات کے اسرار و حقائق پر تو خاصا کام کیا ہے اور اس ضمن میں چند مفید مطلب تصانیف شائع بھی ہوئی ہیں' لیکن حیاتی و معاشرتی علوم پر بہت کم کام نظر سے گزرا ہے' مثلاً خود حیاتیات جس نے بائیوٹیکنالوجی اور جینی انجینئرنگ کے ذریعے انقلاب برپا کر دیا ہے یا حیاتیات کی دوسری اہم شاخیں نباتیات اور حیوانیات ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔ میں اللہ کا نام لے کر قرآنِ حکیم کی طرف رجوع ہوا اور پہلے ان نباتات کی ایک فہرست مرتب کی' جن کا قرآن مجید میں نام لے کر ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی تعداد بیس سے زیادہ نکلی۔ انگور' انار' زیتون' ادرک' پیاز' لہسن' تھوہر' ککڑی' انجیر' رائی' مسور' من' سلویٰ وغیرہ۔ ان کی عملی افادیت پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ روئے زمین سے نمودار ہو کر پوری بنی نوع انسان کو روزِ اوّل سے فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ جن چیزوں کے نام قرآن میں لئے گئے' وہ تو عالمگیر (یونیورسل) ہیں اور دنیا کے ہر خطے اور ہر ملک میں ان کی پیداوار ہوتی ہے۔

سبزیوں' ترکاریوں' پھلوں' پودوں اور درختوں کے الگ الگ نام لینے کے علاوہ قرآن حکیم نے نباتات پر غور و فکر کی صلائے عام بھی دی ہے۔ سورۃ الانعام' آیت ۹۹ میں فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴾

''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا ہے۔ پھر (دیکھو کس طرح) اس کے

ذریعے سے ہم نے طرح طرح کے نباتات اُگائے۔ ان سے سبز تنے اور شاخیں نکالیں اور ان سے ترتیب کے ساتھ چنے ہوئے دانے اور کھجور کے گچھوں سے باریک دھاگوں کے ساتھ جڑے ہوئے خوشے باہر نکالے اور طرح طرح کے انگوروں اور زیتون اور انار کے ایسے باغات نکالے ہیں' جن میں سے بعض آپس میں ملتے جلتے ہیں اور بعض ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جب ان میں سے ہر قسم کے درخت کو پھل آتا ہے تو اس کے پھل کو اور اس کے پکنے کی کیفیت کو دیکھو۔ اس میں ایمان لانے والے لوگوں کے لئے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔''

نباتات کے سلسلے میں یہ بڑی جامع اور ہمہ گیر آیت ہے۔ اس آیت کریمہ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ پودے کے مختلف اعضاء کا تجزیہ انتہائی اختصار کے ساتھ دو سطروں میں کر دیا ہے۔ آسمان کی طرف سے زمین پر پانی اتارنے کا مفہوم یہ ہے کہ روئے زمین پر پانی کے جتنے بھی منابع ہیں' چاہے وہ چشمے ہوں یا دریا' نہریں ہوں یا گہرے کنویں' سب کے سب آخر کار بارش کے پانی کے محتاج ہیں' اسی لئے بارش کی کمی ان سب پر اثر انداز ہوتی ہے اور اگر خشک سالی طول پکڑ لے تو وہ سب کے سب خشک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بارش کے واضح اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اسی کے ذریعے سے تمام نباتات کو ہم نے زمین سے نکالا ہے: ﴿فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ﴾

اس سے مراد ہر قسم اور ہر نوع کی ایسی نباتات ہیں جو ایک ہی پانی سے سیراب ہوتی ہیں اور ایک ہی زمین اور ایک ہی قسم کی مٹی میں پرورش پاتی ہیں اور یہ چیز آفرینش کے عجائبات میں سے ہے کہ یہ تمام قسم قسم کی نباتات اپنے خواص میں مکمل طور پر مختلف ہونے اور بعض اوقات متضاد ہونے اور مختلف شکل وصورت میں ہونے کے باوجود سب کی سب ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی سے کیسے پرورش پاتی ہیں۔ آیت کے اس ٹکڑے کا ایک اور مطلب بھی لیا جا سکتا ہے' یعنی اس سے مراد وہ تمام نباتات ہیں جن کی ہر شخص کو ضرورت اور حاجت ہے' یعنی پرندوں' چوپایوں' حشرات اور دریائی وصحرائی جانوروں میں سے ہر ایک ان نباتات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے' اور یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی زمین سے اور ایک ہی پانی سے ہر جاندار کی ضرورت کے مطابق غذا مہیا کی ہے' اور بے شک یہ قدرت کا عظیم شاہکار ہے کہ ایک ہی معین مادے سے ایک باورچی خانے میں ہزاروں قسم کی غذائیں مختلف مزاجوں اور طبیعتوں کے لوگوں کے لئے مہیا کرتی ہے۔

اور یہ حقیقت بھی ملاحظہ کیجئے کہ نہ صرف صحراؤں اور خشک علاقوں کی گھاس اور سبزہ بارش کے پانی کی برکت سے پرورش پاتے ہیں' بلکہ بہت سی ایسی بے شمار چھوٹی چھوٹی نباتات جو سمندر کے پانی کی موجوں کے درمیان اگتی ہیں اور سمندر میں رہنے والی مچھلیوں کی عمدہ خوراک بنتی ہیں' وہ بھی سورج کی دھوپ اور بارش کے قطروں کے اثر سے نشوونما پاتی ہیں۔ یہ بات آج سائنسی تحقیقات کے بعد پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سمندر کے اندر بارش کے قطروں کا حیات بخش اثر خشک صحراؤں میں بارش کے اثر سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

﴿فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا﴾ بارش کے پانی کے ذریعے سے نباتات کے سبز تنوں اور شاخوں کو زمین سے نکالا ہے اور چھوٹے سے خشک دانے سے ایسا تروتازہ اور سرسبز تنا پیدا کیا ہے کہ جس کی لطافت ونزاکت اور زیبائی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔

﴿نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا﴾ اور اُن سبز تنوں' شاخوں اور ڈنٹھلوں سے ایسے دانے نکالے جو ایک دوسرے کے اوپر موتیوں کی طرح چنے ہوئے ہوتے ہیں' جیسے گندم اور مکئی کے خوشوں میں باہر نکالتے ہیں۔

﴿وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ﴾ اسی طرح پانی کے ذریعے سے کھجور کے درختوں سے سربستہ خوشے باہر نکالتے ہیں جن کے شگافتہ ہونے کے بعد باریک اور خوبصورت دھاگے جو کھجور کے دانوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اور بوجھ کی وجہ سے نیچے کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں' باہر نکلتے ہیں۔

﴿مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ﴾ اس کے بعد عالمِ آفرینش کے ایک اور شاہکار کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وہ ایک دوسرے کے ساتھ شباہت بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں''۔ اشارہ زیتون اور انار کی طرف ہے۔ یہ دونوں درخت ظاہری شکل' نیز شاخوں اور پتوں کی ساخت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ شباہت رکھتے ہیں' جبکہ پھل' ذائقہ اور خاصیت کے لحاظ سے ان میں بہت فرق ہے۔ ان میں سے ایک مؤثر اور قوی روغنی مادہ رکھتا ہے اور دوسرے میں ترش یا میٹھا مادہ ہوتا ہے جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ علاوہ ازیں بعض اوقات یہ دونوں درخت ایک ہی زمین میں پرورش پاتے ہیں اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں' یعنی ایک دوسرے سے بہت زیادہ فرق بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں۔

﴿اُنْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾

نباتات کی شباہت واختلاف پر توجہ دلانے کے بعد بحث کو درخت کے اعضاء سے موڑتے ہوئے ان کے پھلوں سے متعلق بحث کرتے ہوئے کہا گیا: درخت کے پھل کی طرف بھی نظر کرو جبکہ وہ ثمر آور ہوئے' اور اسی طرح پھل کے پکنے کی کیفیت کی طرف نگاہ کرو کہ اِن میں اُن لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں' اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔

جدید زمانے میں نباتات کی افزائش نسل کے ضمن میں بھی خاصی تحقیقات ہوئی ہیں۔ ان تحقیقات کی روشنی میں وہ خاص نکتہ' جس کی طرف قرآن ہماری توجہ مبذول کراتا ہے' واضح ہو جاتا ہے' کیونکہ نباتات کی افزائش بھی بعینہٖ جانداروں میں بچہ پیدا ہونے کی طرح ہے۔ نر نطفے ہوا کے زور سے یا حشرات وغیرہ کے سبب سے مخصوص تھیلیوں سے جدا ہوتے ہیں اور نبات کے مادہ حصے پر جا پڑتے ہیں۔ یہ عمل انجام پانے اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب پانے کے بعد پہلا بیج تشکیل پاتا ہے اور کئی قسم کے غذائی مواد اُسے اطراف میں گوشت کی طرح آغوش میں لے لیتے ہیں۔ یہ غذائی مواد ساخت کے لحاظ سے بہت ہی متنوع اور مختلف ہیں۔ اسی طرح ذائقے اور غذائی وطبی خواص کے لحاظ سے بھی بہت مختلف ہیں۔ کبھی ایک پھل (مثلاً انار اور انگور) میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں کہ جن میں سے ہر دانہ خود جنین اور ایک درخت کا بیج شمار ہوتا ہے اور اس کی ساخت بہت ہی پیچیدہ اور اندر ہی اندر ہوتی ہے۔

پھل کے اندر وہ مختلف مراحل بھی دیدنی ہیں جو ایک پھل کچی حالت سے لے کر پکنے کے عمل تک طے کرتا ہے۔ پھلوں کے اندر کی لیبارٹری ہمیشہ کام میں مشغول رہتی ہے اور ترتیب وار اس کی کیمیائی ترکیب میں تبدیلی آتی رہتی ہے' یہاں تک کہ وہ اپنے آخری مرحلے تک جا پہنچے اور اس کی کیمیائی ترکیب صحیح صورت اختیار کر لے۔ ان میں سے ہر مرحلہ اپنے مقام پر خالقِ کائنات کی عظمت وقدرت کی ایک نشانی ہے۔

نباتات کی جنسی تولید کے بارے میں بھی قرآن حکیم میں واضح اشارے موجود ہیں۔

سورۃ الرعد' آیت ۳ میں فرمایا:

﴿وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ﴾

''اور ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں بنائیں''۔

یا سورۃ یٰسین' آیت ۳۶ میں وضاحت موجود ہے کہ:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ

وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

''وہ اللہ پاک ہے جس نے زمین کی نباتات کے اور خود اُن کے اور جن چیزوں کی اُن کو خبر نہیں سب کے جوڑے بنائے''۔

اس ضمن میں سورۃ الانعام کی آیت ۹۵ میں بیج' دانے اور گٹھلی کی ساخت اور نظامِ نشوونما کی صراحت موجود ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾

''بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر (اُن سے پودے' درخت) اُگاتا ہے۔ وہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے' اور وہی بے جان کا جاندار سے نکالنے والا ہے۔ یہی تو اللہ ہے' پھر تم کہاں بہکے پھرتے ہو؟''

ہواؤں کے ذریعے نباتات کی تخم ریزی' بیج بکھیرنے اور افزائش کے نظام کے بارے میں فرمایا:

﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا﴾ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا﴾

''قسم ہے اُن ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں' پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں' پھر سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی ہیں' پھر ایک بڑے کام (بارش) کی تقسیم کرنے والی ہیں۔''

بنجر زمین کے سرسبز و شاداب ہو جانے اور پھر دوبارہ خشک ہو جانے اور زراعت کے متعلق قرآن حکیم میں متعدد آیات ہیں۔ مثلاً سورۃ الروم کی آیت ۵۰ ملاحظہ ہو:

﴿فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

''دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مُردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح زندہ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

یا مثلاً اسی سورت کی اگلی آیت:

﴿وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ﴾

''اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں' جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو وہ

ناشکری کرنے لگ جائیں۔''

یا مثلاً سورۃ السجدۃ' آیت ۲۷ کی یہ خوبصورت صراحت:

﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَی الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ﴾

''اور کیا ان لوگوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ زمین کی طرف پانی بہالاتے ہیں اور پھر اسی زمین سے وہ فصل اگاتے ہیں جس سے ان کے جانوروں کو بھی چارہ ملتا ہے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں۔ تو یہ دیکھتے کیوں نہیں؟''

یا مثلاً سورۃ حٰم السجدۃ کی آیت ۳۹ میں کتنی خوبصورتی سے زمین کو کھیتی باڑی کے قابل بنانے اور نباتات اگانے کا ذکر آیا ہے:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِیْۤ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے' پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا' یکا یک وہ شاداب ہو جاتی ہے اور پھولنے لگتی ہے۔ یقیناً جو اللہ اس مری ہوئی زمین کو زندہ کرتا ہے' وہ مُردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جو زمین پر روئیدگی' نباتات کی پیدائش و افزائش اور ان کے بطور غذائی و دوائی فوائد کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس سلسلۂ مضامین کے تحت قرآن حکیم کے نامزد نباتات کا تعارف فرداً فرداً اور ردیف وار ترتیب کے ساتھ ''حکمت قرآن'' کے اوراق میں پیش کیا جائے گا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات و احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

فوت شدگان کے لئے دعائے مغفرت کی اہمیت

مدرس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَا الْمَيِّتُ فِي الْقَبْرِ اِلَّا كَالْغَرِيْقِ الْمُتَغَوِّثِ يَنْتَظِرُ دَعْوَةً تَلْحَقُهُ مِنْ اَبٍ اَوْ اُمٍّ اَوْ اَخٍ اَوْ صَدِيْقٍ، فَاِذَا لَحِقَتْهُ كَانَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا، وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُدْخِلُ عَلٰى اَهْلِ الْقُبُوْرِ مِنْ دُعَاءِ اَهْلِ الْاَرْضِ اَمْثَالَ الْجِبَالِ، وَاِنَّ هَدِيَّةَ الْاَحْيَاءِ اِلَى الْاَمْوَاتِ الْاِسْتِغْفَارُ لَهُمْ)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قبر میں مدفون مردے کی مثال بالکل اُس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور مدد کے لئے چیخ پکار رہا ہو۔ وہ بے چارہ انتظار کرتا ہے کہ ماں یا باپ یا بھائی یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعائے رحمت و مغفرت کا تحفہ پہنچے۔ پس جب کسی طرف سے اس کو دعا کا تحفہ پہنچتا ہے تو وہ اس کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتا ہے ——— اور دنیا میں رہنے بسنے والوں کی دعاؤں کی وجہ سے قبر کے مردوں کو اتنا عظیم ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی جا سکتی ہے ——— اور مردوں کے لئے زندوں کا خاص ہدیہ ان کے لئے دعائے مغفرت ہے''۔

بخشش اور مغفرت کا ہر شخص محتاج ہے' کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے نیک اعمال کی بدولت نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ کسی شخص کے اعمال اس درجہ کامل نہیں ہو سکتے کہ وہ جنت کا مستحق قرار دیا جا سکے' کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہر بندے پر اتنے احسانات ہیں کہ وہ حد درجہ عبادت اور فرمانبرداری کر کے بھی ان کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔ لہٰذا یہ تعلیم دی گئی ہے کہ بندہ اللہ کے احکام کی ممکن حد تک تعمیل کرے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی کوتاہیوں پر بخشش بھی مانگتا رہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک بار ارشاد فرمایا تھا کہ کوئی بندہ اپنے اعمال کی بدولت جنت میں نہیں جا سکتا۔ جب کسی نے پوچھا کہ کیا حضور ﷺ آپ بھی؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''ہاں

میں بھی اِلّا یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ معروف کی پیروی کرنا اور منکرات سے بچنا انتہائی ضروری ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ مغفرت کی درخواست کرنا بھی ہر وقت کا معمول ہونا چاہئے' کیونکہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے کہ بندہ نیک اعمال اختیار کرنے کے باوجود اپنی کوتاہیوں' غلطیوں اور خامیوں پر اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتا رہے اور بخشش مانگتا رہے۔ خود قرآن مجید میں استغفار کی تاثیر اِن الفاظ میں مذکور ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (الانفال:۳۳)

''اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ وہ بخشش مانگیں اور پھر بھی وہ انہیں عذاب دے''۔

چنانچہ ہر بندے کو اِس سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ احادیث میں وارد ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ ہر دن میں کثرت کے ساتھ استغفار کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''خدا کی قسم! میں دن میں ستر دفعہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ اور استغفار کرتا ہوں''۔ (صحیح البخاری)

اپنے لئے بخشش مانگنا تو ہے ہی مگر دوسروں کے لئے بخشش کی دعا کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ اور اس مضمون کو نہ صرف قرآن مجید میں محکم کہا گیا ہے بلکہ استغفار کے کلمات بھی سکھائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ (ابراھیم:٤١)

''اے ہمارے پروردگار! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان والوں کو حساب کے دن''۔

نیز دوسروں کے لئے بخشش مانگنا خود اپنے حق میں بھی بے انتہا مفید ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ عام ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے گا اس کے لئے ہر مومن مرد و عورت کے حساب سے ایک ایک نیکی لکھی جائے گی''۔ (معجم کبیر للطبرانی)

جو شخص فوت ہو جاتا ہے اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے' اب وہ کوئی نیک کام نہیں کر سکتا۔ نہ وہ نمازیں پڑھ سکتا ہے' نہ روزے رکھ سکتا ہے' نہ وہ مسکین کو کھانا کھلا سکتا ہے اور نہ ہی کسی ضرورت مند کے کام آ سکتا ہے' مگر نیکیوں کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ اب یا تو اسے باقیات الصالحات نفع پہنچا سکتی ہیں یا پھر پیچھے رہنے والوں کا استغفار اس کے لئے فائدہ

مند ہوسکتا ہے۔ باقیات الصالحات سے مراد تو مرنے والے کے وہ نیک اعمال ہیں جن کی نفع رسانی جاری ہے۔ مثلاً کسی کو نیک کام پر لگایا' تو جب تک وہ نیک عمل کرتا رہے گا اس شخص کو بھی اس کا ثواب ملتا رہے گا۔ کسی کو دین کا علم سکھایا اور اس نے آگے دوسروں کو وہ علم سکھایا' یا مسجد' مدرسہ یا ہسپتال قائم کر دیا اور اس سے لوگوں کو مسلسل فائدہ پہنچ رہا ہے تو ان نیکیوں کا ثواب مرنے والے کو بھی لگاتار پہنچتا رہے گا۔ اندازہ کیجئے کہ جب وہ خود دارالعمل سے گزر چکا اور اب وہ کسی طرح کی نیکی از خود نہیں کر سکتا تو اس کو پیچھے کی ہوئی نیکیوں کا ثواب ملے گا تو اس کی روح کو کس قدر خوشی ہوگی! اسی طرح مرنے والے کے پیچھے رہنے والے جب اس کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں تو اس کا بھی اسے حد درجہ فائدہ پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مومن فوت ہوتا ہے تو دفن ہونے سے پہلے اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے جو نہ صرف اس کے لئے مغفرت کی دعا ہے بلکہ جملہ زندوں اور مُردوں کے حق میں بھی بخشش کی التجا ہے۔ یہ نمازِ جنازہ میت کے لئے بخشش کا باعث تو ہے ہی خود نماز جنازہ پڑھنے والا بھی اللہ کے ہاں بڑا اجر پاتا ہے۔ حضرت مالک بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس مسلمان بندے کا انتقال ہو جائے اور مسلمانوں کی تین صفیں اس کی نماز جنازہ پڑھیں (یعنی اس کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں) تو ضرور ہی اللہ تعالیٰ اس بندے کے واسطے (مغفرت) واجب کر دیتا ہے''۔ (سنن ابی داؤد)

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ ''جس میت پر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نماز پڑھے جن کی تعداد سو تک پہنچ جائے اور وہ سب اللہ کے حضور میں اس کے لئے سفارش کریں' یعنی مغفرت اور رحمت کی دعا کریں' تو اُن کی یہ سفارش اور دعا ضرور ہی قبول ہوگی''۔ (صحیح مسلم)

اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث میں نماز جنازہ پڑھنے اور میت کے حق میں دعائے مغفرت کرنے کی فضیلت مذکور ہے۔

زیر درس حدیث میں مُردے کی بے بسی کو واضح کیا گیا ہے کہ گویا وہ ڈوبنے والے کی مانند ہے جو مدد کے لئے چیخ و پکار کر رہا ہو کہ کوئی اس کی مدد کو پہنچے' کیونکہ مرنے والا خود تو کسی طرح کا عمل کر نہیں سکتا البتہ زندہ لوگ اس کے لئے بخشش کی دعا کر کے اس کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں' چنانچہ مرنے والا اس بے بسی اور بے چارگی میں انتظار کرتا ہے کہ اس کے ماں باپ' بھائی یا کسی دوست کی طرف سے اسے مغفرت اور رحمت کی دعا کا تحفہ پہنچے اور اس

آڑے وقت میں اس کے کام آئے۔ پس اُس عالَم میں جب کسی زندہ کی طرف سے اسے دعا کا تحفہ پہنچتا ہے تو وہ اسے دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز اور محبوب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ ایسی پائیدار نیکیاں کرو جو مرنے کے بعد بھی مسلسل ثواب کا سبب بنیں اور اپنے موتی کے لئے کثرت کے ساتھ دعائے مغفرت کرو تا کہ بے بسی کے وقت ان کے کام آسکیں۔ پھر اس حدیث میں آپ نے دیکھا کہ زندوں کی طرف سے استغفار کے اس تحفہ پر قبر والوں کو اتنا ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی جا سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ استغفار کے جن الفاظ کو ہم زبان پر بڑے ہلکے پھلکے محسوس کرتے ہیں اہل قبور کے حق میں ان کا منافع بے حد وحساب ہے۔

استغفار کے الفاظ کے اختصار اور زبان سے ادائیگی میں سہولت کی وجہ سے عام آدمی اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا اور مطمئن نہیں ہو پاتا' لہٰذا اہلِ قبور کو ایصالِ ثواب کے لئے لوگ مختلف ناموں سے تقریبات منعقد کر کے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ وقت بھی صرف کرتے ہیں' پیسے بھی خرچ کرتے ہیں اور طرح طرح کے تکلفات سے بھی کام لیتے ہیں' مگر یہ طریقے نہ تو مسنون ہیں اور نہ ہی ان پر اجر کا وعدہ ہے' بلکہ علمائے حق کے نزدیک یہ سراسر بدعات ہیں۔ پھر اصل کو چھوڑ کر بے اصل کی طرف رجوع کرنا ہرگز دانش مندی نہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ اہل قبور کو نفع پہنچانے کا وہ آسان' سہل اور ہلکا پھلکا طریقہ اختیار کریں جو مسنون ہے اور جس کا فائدہ موعود اور یقینی ہے' کیونکہ اس کی خبر خود رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔ ہاں' استغفار کے علاوہ کوئی ایسا نیک کام کرنا جس میں مال خرچ ہوتا ہو' ایسے نیک کام بھی علماء کے نزدیک اہل قبور کو ثواب پہنچانے کے لئے کرنا جائز ہیں' مثلاً کسی فوت شدہ عزیز کی طرف سے کسی بھوکے کو کھانا کھلانا' غریب مسکین کی امداد کرنا' ضرورت مند کو کپڑا پہنانا' افادۂ عام کے لئے دواخانہ بنانا' دینی مدارس کے طلبہ پر خرچ کرنا' مسجد بنوانا' مسجد کی ضروریات پر خرچ کرنا وغیرہ۔ یہ وہ کام ہیں جن میں پیسے تو خرچ ہوتے ہیں مگر کسی تقریب کے منعقد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر اسلام کا مزاج بھی یہی ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو مشکلات میں نہیں ڈالتا' بلکہ سہولت اور آسانی کی تعلیم دیتا ہے اور بے جا اخراجات اور فضول کاموں میں تضییع اوقات سے روکتا ہے' بلکہ بلاضرورت خرچ کرنے والوں کو تو قرآن میں اخوان الشیطین (شیطانوں کے بھائی) کہا گیا ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہئے کہ اپنے فوت شدگان کے حق میں دعائے مغفرت پر اکتفا کریں اور اس کی تاثیر پر یقین رکھیں کہ یہی رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

بختیار حسین صدیقی مرحوم ☆

حصولِ تعلیم انسان کا مذہبی فریضہ ہے' کیونکہ تعلیم اس کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اور چونکہ زندگی کی اساس روحانی اور ابدی ہے اس لئے ابدیت کے نقطۂ نگاہ سے انسان کی ضروریات کو پورا کر کے وہ اس کے لئے ایک نظامِ کردار مرتب کرتی ہے جسے ثقافت کہتے ہیں۔ وہ ثقافت کی تشکیل ہی نہیں کرتی بلکہ نئی نسل میں اسے منتقل کر کے اس کا تحفظ بھی کرتی ہے۔

کسی قوم کی ثقافت زندگی کے متعلق اس کے مخصوص عقیدے یا تصور پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ تصور ہی اس کی ثقافت کی روح رواں ہوتا ہے۔ اسلامی ثقافت کی بنیاد جس تصور پر استوار ہے وہ ہے توحید کا تصور جو اخلاقی اور روحانی قوت کو زندگی کا اصل محرک قرار دیتا ہے۔ توحید کا تصور کوئی بے جان مجرد تصور نہیں' بلکہ ایک ''زندہ قوت'' اور ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ جب انسان کے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے اور اس کے دل میں اس طرح گھر کر لے کہ اس کی فکر' احساس اور ارادہ سب اس تصور کی تفسیر بن جائیں تو وہ ایک جیتی جاگتی حقیقت بن جاتا ہے۔ خیال یا تصور میں بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے تنظیم کا اصول فراہم کرتا ہے اور معاشرے میں خاطر خواہ تبدیلی لانے کے لئے مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ یہ توحید کے تصور ہی کی قوت تھی جس کی بدولت رسول اکرم ﷺ کی قیادت میں ایک ایسا معاشرہ قائم ہوا جس میں مہاجر و انصار کی کوئی تمیز نہ تھی' غریب اور امیر کا کوئی فرق نہ تھا۔ زبان' رنگ' خون' وطن اور نسل کی کوئی تفریق نہ تھی' جس کی روحِ رواں صرف اور صرف اخوت' محبت اور رواداری یعنی آدمیت کے احترام کا جذبہ تھا۔ خیالات میں تبدیلی ہمیشہ معاشرتی نظام میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔

توحید کا تصور اسلام کی تمام تعلیمات کی اساس ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بنیادی تصور کا مکمل علم کس طرح حاصل کیا جائے کہ ہماری زندگی عملی طور پر اس تصور کی

☆ سابق پرنسپل قرآن کالج لاہور

تفسیر بن جائے۔ علم چونکہ عمل کی لازمی شرط ہے اس لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اسلام کے نظریۂ علم کی طرف رجوع کریں۔ قرآن نے حواس اور عقل کو علم کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن صرف ان کے بل بوتے پر توحید کا علم نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ توحید کے علم کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے وحی، جس کا ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ خدا صرف اپنے خاص بندوں کو وحی کے ذریعے توحید کا علم عطا کرتا ہے۔ ان خاص بندوں کو پیغمبر کہتے ہیں۔ صرف پیغمبروں ہی کو توحید کا صحیح اور مکمل علم ہوتا ہے۔ بقیہ انسانوں کا فرض ہے کہ وہ پیغمبر کی تعلیم پر بے چون و چرا ایمان لائیں اور پھر اس تعلیم کی روشنی میں عقل و فکر کے ذریعے توحید کا علم حاصل کرنے کی کوشش کریں، جتنا کچھ علم وہ اپنی بساط کے مطابق حاصل کر سکتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ علم جزئی علم ہوگا اور کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اس میں درجات کا فرق بھی ہوگا، کیونکہ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق ہی علم حاصل کر سکتا ہے۔ ایمان علمِ حق کی اوّلین شرط ہے۔ جس شخص کو پیغمبر کی تعلیم پر پختہ یقین ہے وہ اس یقین کی قوت کی بدولت اپنی عقل کے مطابق توحید کا جزئی علم حاصل کر سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ ایمان پہلے، عقلی استدلال اور استنباط بعد میں۔ یہ ہے عقل کے ذریعے توحید کا علم حاصل کرنے کی لازمی شرط۔ صرف ''اہل یقین'' کے لئے، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: ''انفس'' میں خدا کی نشانیاں ہیں اور ''آفاق'' میں بھی''۔[1] انہی لوگوں کو قرآن نے توحید کا نقش اپنے دل پر ثبت کرنے کے لئے فطرت کا مشاہدہ کرنے اور اس پر غور و فکر کرنے کی بار بار تاکید کی ہے۔

اسلامی طریق تعلیم

توحید کی تلقین اور ''کتاب و حکمت'' کی تعلیم دینے کے لئے رسول اکرم ﷺ کو معلم بنا کر بھیجا گیا۔ معلم کی حیثیت سے آپ ﷺ کو وہ اصول اور طریقے بھی بتائے گئے جو تعلیم کو خوشگوار، مؤثر اور کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ پہلی بات آپ ﷺ کو یہ بتائی گئی کہ مؤثر تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ جس قسم کے لوگوں کو تعلیم دینا مقصود ہو۔ اسی ماحول سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو اُن کا معلم مقرر کیا جائے جو اُن کی افتادِ طبع، طور طریقوں اور خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ چنانچہ:

---

(۱) سورۃ الذاریات میں ارشاد ہوا: ﴿وَفِي الْأَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۞ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۞﴾ (آیات ۲۰، ۲۱) جبکہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾ (آیت ۵۳)

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعة:۲)

''وہی ہے (اللہ) جس نے اُمیوں میں انہی میں کا ایک رسول بنا کر بھیجا' تا کہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی آیتیں سنائے' ان کا تزکیہ کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے''۔

اور جب لوگوں نے خیر البشر ﷺ سے پوچھا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو حکم ہوا کہ:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا﴾ (الاسراء:۹۵)

''آپ فرما دیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے ہوتے کہ اس میں چلتے اور بستے تو البتہ ہم ان پر آسمانوں سے کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے''۔

دوسری بات آپ ﷺ کو یہ بتائی گئی کہ کسی کو زبردستی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ استاد کا فرض ہے کہ پہلے وہ علم کی صحیح پیاس اور خواہش پیدا کرے اور پھر تعلیم دے۔ تعلیم کی بنیاد انسان کی اپنی خود متحرکی پر ہے۔ استاد اس خود متحرکی کو تقویت پہنچا سکتا ہے لیکن کسی شخص میں اگر یہ مطلقاً موجود ہی نہ ہو تو وہ اسے زبردستی اُس میں پیدا نہیں کر سکتا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِیْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ ۚ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْكَ ۚ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَلَوْ كَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ ۝﴾ (یونس:۴۱-۴۳)

''اور اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو فرما دیجئے کہ میرے لئے میرے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ جو عمل میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے اور جو عمل تم کرتے ہوئے اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف ظاہر میں آپ کی طرف کان لگا کر بیٹھتے ہیں' کیا آپ بہروں کو سنا کر اُن کے ماننے کا انتظار کرتے ہیں' گو اُن کو سمجھ بھی نہ ہو۔ اور اسی طرح ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو صرف ظاہری طور پر آپ کو (مع معجزات اور کمالات) دیکھ رہے ہیں۔ پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھانا چاہتے ہیں' گو اُن میں بصیرت نہ ہو''۔

جس شخص کے دل میں علم کی لگن اور طلب نہ ہو' جسمانی طور پر تو وہ معلم کے سامنے بیٹھا ہو لیکن ذہنی طور پر اس کی دلچسپیوں کا مرکز کہیں اور ہو اُسے تعلیم دینے سے کچھ فائدہ نہیں۔

تیسری بات آپ ﷺ کو یہ بتائی گئی کہ تعلیم دراصل ابلاغ کا نام ہے اور ابلاغ کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔ ہر قوم کا اپنا اسلوبِ بیان ہوتا ہے جو اُس کی زبان کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ ابلاغ کی جو آسانیاں اور سہولتیں مادری زبان میں ہوتی ہیں کوئی دوسری زبان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ زبان خیال کی ترجمان ہوتی ہے۔ مادری زبان ترجمانی کا یہ حق بہ طریق احسن ادا کرتی ہے' اس لئے سننے والے کو بات سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اسلوب بیان اتنا واضح اور مانوس ہوتا ہے کہ بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے ہر قوم میں ایسا پیغمبر بھیجا گیا جو اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ وہ ان کی زبان میں انہیں توحید کی تعلیم دے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ﴾ (ابراھیم: ٤)

''ہم نے ہر قوم میں ایسا پیغمبر بھیجا جو ان کی زبان بولتا تھا تاکہ وہ (حق کی بات ان کی زبان میں) ان کے سامنے بیان کر دے''۔

پہلی بات کا تعلق معلم کے انتخاب سے ہے' دوسری کا متعلم کے انتخاب سے اور تیسری کا تعلیم دینے کے لئے زبان کے انتخاب سے۔ اس کے بعد طریق تعلیم اختیار کرنے کی باری آتی ہے کہ توحید کی تعلیم کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ قرآن نے اس سوال کا مختصر لیکن جامع جواب دیا ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ﴾ (النحل: ١٢٥)

''بلائیے اپنے رب کی راہ پر حکمت اور عمدہ طریقے سے نصیحت کے ذریعے اور ان سے بحث کیجئے بہترین طریقے سے''۔

اس آیت میں تدریس کے تین بنیادی اصول بتائے گئے ہیں' حکمت' نصیحت اور بحث۔ قرآن چونکہ سرچشمۂ حکمت ہے' اس لئے معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے حکیمانہ نکات پر گہری نظر رکھتا ہو تاکہ وہ اس کے احکام کی حکمت کو اچھی طرح لوگوں کے دلوں میں بٹھا سکے اور ذہنی طور پر انہیں مطمئن کر سکے۔ قرآن نے تدریس کے اس اصول کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ﴾ (البقرة: ٢٦٩)

''جسے حکمت دی گئی اسے تو خیر کثیر دے دی گئی''۔

حکمت کی اسی اہمیت کی بنا پر اُموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا اور بعد ازاں علم کلام کی شکل میں اسلامی نصاب کا جزو بن گیا۔ غور وفکر کے ساتھ ساتھ فطری وجدان کی نشوونما کے لئے تصوف نے بھی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں جگہ پائی۔

تدریس کا دوسرا بنیادی اصول عمدہ طریقے سے نصیحت کرنا ہے۔ جس طرح پہلا اصول تعلیمی عمل میں فلسفے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اسی طرح دوسرا اصول نفسیات کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ کسی شخص کو جب اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر نصیحت کی جائے تو ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس کی دل آزاری نہ ہو' وہ اس میں اپنی ذلت محسوس نہ کرے' ورنہ وہ انہیں دور کرنے کے لئے کبھی اقدام نہیں کرے گا۔ تعلیم کا مقصود متعلم کی خود متحرکی کو تقویت پہنچانا ہے' جو نرمی' شفقت اور ہمدردی کے رویئے کا متقاضی ہے۔ سختی اور درشتی کا انسان پر الٹا اثر پڑتا ہے۔ اپنی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے وہ اس پر اور دلیر ہو جاتا ہے' ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے۔ اسی نفسیاتی ردِعمل کے پیش نظر جب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی تنبیہ کے لئے بھیجا گیا تو انہیں واضح طور پر ہدایت کی گئی کہ:

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ (طٰہٰ: ٤٤)

''اس سے نرمی سے بات کرنا' شاید وہ (برضا ورغبت) نصیحت قبول کرلے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے''۔

تدریس کا تیسرا بنیادی اصول بحث وجرح ہے۔ حکمت اور نصیحت سے کام نہ چلے تو پھر معلم کو چاہئے کہ وہ بحث کی طرف رجوع کرے۔ لیکن اس بات کا لحاظ رکھے کہ طریق بحث استدلال اور کلام دونوں اعتبار سے بہترین اور معیاری ہو۔ بحث عقلی دلائل پر مبنی ہو اور دلائل اتنے قوی اور مستحکم ہوں کہ مخاطب کو انہیں قبول کرتے ہی بنے۔ بحث کی ابتدا چونکہ سوال سے ہوتی ہے' اس لئے قرآن نے سوال کرنے کی بالخصوص تاکید کی ہے:

﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (الانبیاء:٧)

''اگر تم کوئی بات نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو''۔

علم ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کی کنجی سوال ہے۔ بحث کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ مثلاً الفاظ کو واضح اور متعین مفہوم میں استعمال کیا جائے۔ خیالات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہوں اور دلائل تضاد سے پاک ہوں۔ اس ضرورت کے پیش نظر اُموی اور عباسی دَور میں یونانی منطق عربی زبان میں منتقل ہوئی اور اسلامی نصاب کا ایک حصہ بن گئی۔

اسلام نے صرف استخراجی طریقے کو تعلیم کا ذریعہ نہیں بنایا' تحلیل و تجزیے کے استقرائی طریقے کو بھی اس نے اتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی کہ استخراجی طریق فکر و استدلال کو۔ جہاں اس نے بحث و جرح پر زور دیا ہے (جس میں استخراجی طریق استعمال ہوتا ہے) وہاں مظاہر قدرت کے مشاہدے اور ان پر غور و فکر کی بھی بار بار تاکید کی ہے۔ قدرت کی بنائی ہوئی نباتات' جمادات' حیوانات' معدنیات وغیرہ کے تجزیے سے ان کی ساخت' وظائف اور خواص کا جو علم حاصل ہوتا ہے اس سے بھی توحید کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ بصارت جب بصیرت کے ساتھ اس طرح متحد ہو جائے تو انفس اور آفاق میں ہر جگہ اللہ کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔

﴿... وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۞ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۞﴾ (الرعد:۲'۳)

''(اور اُس نے) سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا' ہر ایک ایک وقت معین تک چلتا رہتا ہے۔ وہ تدبیر کرتا ہے اُمر کی' ظاہر کرتا ہے نشانیاں تاکہ تم اپنے پروردگار سے ملنے کا یقین کرو۔ وہی تو ہے جس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں' اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پھل پیدا کئے' وہ رات کی تاریکی سے دن کو چھپا دیتا ہے۔ ان امور میں سوچنے والوں کے لئے (اللہ کی) نشانیاں موجود ہیں''۔

اسلام کی رو سے تعلیم انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ لیکن انسان صرف روح نہیں ہے' وہ جسم کے قالب میں ایک روح ہے اور جسم کا تعلق اس فانی دنیا سے ہے۔ جسم روح کے لئے ایک آلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آلہ استعمال کرنے والے کا کمال چونکہ آلے کے خود اپنے کمال پر بھی بڑی حد تک منحصر ہوتا ہے اس لئے روح کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ جسم کی ضرورتوں کا پورا کرنا بھی تعلیم کا فرض ہے۔ قرآن کا حکم ہے:

﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (القصص:۷۷)

''دنیا سے اپنا حصہ لینا مت بھولو''۔

اور قرآن حکیم میں وارد یہ دعا کس قدر جامع ہے:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۞﴾

(البقرۃ:۲۰۱)

''اے ہمارے ربّ! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما' اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ!''۔

سورۃ البقرۃ میں علم کے ساتھ ساتھ جسمانی وجاہت اور قوت کو بھی مال و دولت پر برتری کی وجہ بتایا گیا ہے۔ حضرت طالوت کا ذکر ہے:

﴿وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ﴾ (البقرۃ:۲۴۷)

''اور اللہ تعالیٰ نے علم اور جسم کے سلسلے میں اسے زیادہ کشادگی دی''۔

پس تعلیم کا مقصد روح اور جسم دونوں کی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ روح کی ضروریات کو پورا کرنے کا قرآن نے مفصل اور جامع طریقہ بتایا ہے' لیکن جسم کی ضروریات کو پورا کرنا اس نے انسان کی اپنی عقل وفکر پر چھوڑ دیا ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم' فنی تعلیم وغیرہ کا نظام معاشرتی ضروریات کے اعتبار سے اسے خود مرتب کرنا ہے۔ البتہ فنی تعلیم کی اہمیت کا قرآن نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ مثلاً:

﴿وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ (الحدید:۲۵)

''اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے لئے (بہت سے) فائدے ہیں۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کے بیان میں لوہے میں نرمی اور لچک پیدا کرنے کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ﴾ (سبا:۱۰)

''اور ہم نے اس کے واسطے لوہے کو نرم کیا۔''

ہر نصاب تعلیم میں کتاب کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور لیکچر بنیادی طریق تدریس ہوتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کو ''کتاب'' کی تعلیم دینے کے لئے ''معلم'' بنا کر بھیجا گیا۔ جیسے جیسے آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی آپ اس کے احکام کی حکمت کو نصیحت اور بحث کے پیرائے میں تلقین کرتے رہتے تھے۔ قرآن پر کفار کا اعتراض اور اس کا جواب یوں مذکور ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا﴾ (الفرقان:۳۲)

''کفار نے کہا پیغمبر پر قرآن پورا کا پورا ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ اس لئے کہ ہم اس کے ذریعے سے آپؐ کے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو پڑھ

سنایا ہے ٹھہر ٹھہر کر''۔

دل کو مضبوط کرنے سے مراد اسلام کی تعلیمات کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا ہے اور یہ مقصد ''ٹھہر ٹھہر کر'' وقفہ دے کر پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے' نہ کہ بغیر توقف کے لگا تار پڑھنے سے۔ بغیر وقفے کے پڑھنے سے ذہن تھک جاتا ہے اور حافظے پر اس کا منفی اثر پڑتا ہے۔ وقفہ دے کر پڑھنے سے ذہن تازہ دم رہتا ہے۔ سمجھنے' یاد کرنے اور یاد رکھنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس نفسیاتی نکتے کو ایک اور آیت میں اس طرح بیان کیا ہے:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾

(الاسراء:۱۰۶)

''ہم نے قرآن کو اس لئے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کیا کہ تو آہستہ آہستہ اسے لوگوں کو پڑھ کر سنائے اور ہم نے اس کو بتدریج نازل کیا''۔

اس سے تدریس کا یہ اصول مرتب ہوا کہ اگر سبق چھوٹا ہو تو پورا سبق ایک ہی بار پڑھا دیا جائے' ورنہ سبق کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر لیا جائے اور انہیں بتدریج پڑھایا جائے تاکہ توجہ دینے اور یاد کرنے میں آسانی رہے۔ مضمون کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے اگلا حصہ پڑھاتے وقت پچھلے حصے سے اس کا تعلق ضرور بتایا جائے۔

''تدریج'' کے اصول کا اطلاق جس طرح کتاب کے مطالعے اور اس کے درس پر ہوتا ہے اسی طرح کردار کی اصلاح اور سیرت کی تعمیر پر بھی ہوتا ہے جو اسلام کی رو سے تعلیم کا اصل مقصود ہے۔ عادت طبیعت ثانیہ ہوتی ہے' اسے یک دم بدلا نہیں جا سکتا' البتہ رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔ کسی بری عادت کو چھوڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس کے لئے آمادہ کیا جائے۔ عزم میں جب پختگی آ جائے تو جزوی طور پر اس پر عمل شروع کر دیا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ عزم کی قوت بڑھے گی اور مذموم عادت کی گرفت ڈھیلی پڑتی جائے گی۔ اس عمل کا بالآخر یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ عادت ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے گی۔ یہ ہے کسی عادت کے چھوڑنے کا نفسیاتی قانون جس کے مطابق قرآن نے ''بتدریج'' شراب نوشی چھوڑنے کی تلقین کی ہے۔ پہلے مرحلے میں صرف اس بات پر زور دیا گیا کہ شراب نوشی کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی' لیکن اس کے نقصانات فائدوں سے زیادہ ہیں:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹)

''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ دونوں گناہ کبیرہ ہیں' البتہ ان میں لوگوں کے لئے (کچھ) فائدے بھی ہیں' لیکن فائدے کے مقابلے میں گناہ کا پلہ بھاری ہے''۔

اس آیت میں شراب کو ایک دم ممنوع نہیں قرار دیا گیا۔ ذہنی طور پر لوگوں کو شراب نوشی چھوڑنے پر آمادہ کرنے کے لئے صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس میں گناہ زیادہ ہے اور فائدہ کم۔ جب شراب کے گناہ ہونے کا عقیدہ لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوگیا تو حکم ہوا کہ:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ (النساء:٤٣)

''اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ' یہاں تک کہ تمہیں اتنا ہوش آجائے کہ جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو اُس کا تمہیں علم ہو''۔

اس جزوی پابندی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ عادت کی گرفت ڈھیلی پڑی اور ارادے کی قوت بڑھی تو شراب کو مطلقاً حرام قرار دے دیا گیا۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (المائدة: ٩٠)

''اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بُت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں' سو ان سے الگ ہو جاؤ تا کہ تم فلاح پاؤ''

علم کی کوئی حد نہیں ہے۔ ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی:

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾ (یوسف:٧٦)

''اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جاننے والا''

اس لئے کسی ایک عالم سے پڑھ کر تحصیل علم کا شوق پورا نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی عالم ملے اس سے فیض اٹھایا جائے خواہ اس کی خاطر دُور دراز کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا کہ خضر علیہ السلام کو اُن باتوں کا علم ہے جو انہیں معلوم نہیں تو وہ ان کی تلاش میں نکل پڑے۔ جس جذبے کے ساتھ وہ اس سفر پر نکلے تھے قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِفَتٰهُ لَا أَبْرَحُ حَتّٰى أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا﴾ (الکهف: ٦٠)

(باقی صفحہ 58 پر)

مصارفِ زکوٰۃ
اور
عصر حاضر (اکیسویں صدی عیسوی) میں
مصالح اُمّت محمدیؐ

انجینئر مختار حسین فاروقی کی تحریر پر ایک تنقیدی جائزہ

تحریر: راشد یار خان

تمہید:

گزشتہ سو سال میں بعض اہل علم کی طرف سے ''فی سبیل اللہ'' کو عام قرار دینے والے ''قولِ شاذ'' کی نہ صرف بھرپور تلقین ہوتی رہی ہے بلکہ ''فی سبیل اللہ'' کو عام کر دینے کی پرزور وکالت کے ساتھ ساتھ علماء اور مفتیانِ کرام کو مشورہ بھی دیا جاتا رہا ہے کہ وہ ان کی گزارشات کی روشنی میں اپنے فتویٰ میں تبدیلی اور اصلاح کر لیں، یعنی فی سبیل اللہ کے عام ہونے اور تملیک کی شرط ختم ہونے کا فتویٰ دے دیں۔

''حکمت قرآن'' کے ماہِ اپریل کے شمارے میں محترم مختار حسین فاروقی صاحب کی تحریر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ گو کہ اس تحریر کا انداز مسئلہ کو کسی ایک جانب ثابت کرنے کا نہیں بلکہ صاحب مضمون نے آج کے اس روبہ زوال اسلامی معاشرے میں انفاق کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں میں انفاق کی کم سے کم درجہ میں واحد صورت زکوٰۃ ہی باقی رہ گئی ہے لہٰذا عصر حاضر میں اس مقصد کے حصول کے لئے اسی کا سہارا لیا جائے اور سورۃ التوبہ کی آیہ ۶۰ میں مذکورہ مدوں میں سے ایک مد ''فی سبیل اللہ'' کے تحت زکوٰۃ کو عموم دے کر مصالح محمدی میں خرچ کیا جائے۔ مذکورہ

مضمون میں شریعت کے کسی مسئلہ میں مشورہ دینے اور فتویٰ طلب کرنے کا انداز بالکل نیا اور بڑا دلفریب ہے' بالخصوص تعبدی امور کے مسائل میں جن پر اُمت ۱۴۰۰ سال سے عمل پیرا ہے' صرف حالات کا دکھڑا سنا کر اور مرورِ زمانہ کو دلیل بنا کر ان میں تبدیلی کرنے کی سفارش کرنا اور شریعت کے اصل اور بنیادی ماخذات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے لغوی تحقیق پر اکتفا کرنا نہ صرف اس مسئلہ بلکہ ہر شرعی مسئلہ میں گمراہی کے بے شمار دروازے کھول دے گا۔

زکوٰۃ کے مصرف ''فی سبیل اللہ'' کے حوالے سے میں اپنی گزارشات مع دلائل پہلے ہی انجمن اور تنظیم کے اکابرین تک تحریراً پیش کر چکا ہوں' لیکن ''حکمت قرآن'' میں فاروقی صاحب کی تحریر میں کچھ باتیں خلافِ حقیقت ہیں جن کی وجہ یقیناً کچھ مغالطے ہی ہوں گے۔ ان کی حقیقت بیان کرنا بھی میری ذمہ داری ہے اور اس تحریر کا تجزیہ کرنا بھی اس لئے نہایت ضروری ہے کہ محترم فاروقی صاحب نے جو دلنشین طرزِ استدلال اپنایا ہے وہ کم از کم شرعی مسائل میں نہایت مہلک ثابت ہوسکتا ہے' کیونکہ اس طرزِ استدلال کو اگر اصولی طور پر مان لیا جائے تو نہ صرف شریعت کا تیا پانچا ہو جائے گا بلکہ تقریباً روزانہ ہی علماء اکرام اور مفتیانِ عظام کو شریعت میں تبدیلی کی پرزور سفارش کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر وہ نہ مانے تو کم از کم یہ الزام تو اُن کے سر لگ ہی جائے گا کہ علماء عصرِ حاضر کے علوم اور تقاضے نہیں سمجھتے اور یہ کہ مصالحِ اُمّتِ محمدی حاصل کرنے میں آج سب سے بڑی رکاوٹ خود علماء ہی ہیں۔

سب سے پہلے ان خلافِ حقیقت باتوں کا جائزہ لے لیا جائے جن کا تذکرہ میں نے تمہیدی امور میں کیا ہے۔

خلافِ حقیقت باتوں کی حقیقت

پہلی خلافِ حقیقت بات:

محترم فاروقی صاحب کی تحریر میں پہلی خلافت حقیقت بات ''صورت مسئلہ'' کے عنوان سے ہے جو صفحہ ۲۶ پر آئی ہے۔ دوسرے پیراگراف میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس تغیر کی مثال یہ ہے کہ خیر القرون کے قریب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ مزارعت حرام ہے' تاہم چند عشروں کے فرق کے ساتھ حالات بدلے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے مشروط مزارعت کے جواز کی رائے دی۔ ہم ظاہراً اسے اختلاف کا رنگ دیتے ہیں کہ شاگرد نے استاد سے

اختلاف کیا' حقیقتاً یہ ظروف واحوال کی تبدیلی کی وجہ سے اجتہاد کا نتیجہ تھا''۔

اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے تو امام ابو یوسفؒ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی رائے سے متفق تھے مگر تیس چالیس سال بعد تغیر حالات کی وجہ سے انہوں نے اپنی رائے بدل دی اور جواز کا فتویٰ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے مزارعت کو حرام قرار دیا تو دلائل شرعیہ کی بنیاد پر دیا اور امام ابو یوسفؒ نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور اپنے استاد سے اختلاف کیا تو ان کے لئے انہوں نے احادیث رسول ﷺ سے دلائل دیئے۔ ان کے جواز کا فتویٰ احادیث صحیحہ کی بنیاد پر ہے نہ کہ چند عشروں کے بدلے ہوئے حالات کے فرق کی وجہ سے۔

دوسری خلاف حقیقت بات:

اسی صفحہ نمبر ۲۶ میں متصل بعد محترم فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''اسی طرح حدیث میں تصریحاً ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد غازی فی سبیل اللہ ہے۔ فقہاء نے اس حدیث کو عموم پر قیاس کیا اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں غازی کے علاوہ دوسرے اشخاص کو بھی شامل کر دیا۔ یہ اجتہاد 'فی سبیل اللہ' کے لفظ میں عموم پر دلالت کرتا ہے کہ حالات کے بدلنے سے فی سبیل اللہ کے معنی میں موقع اور محل کی مناسبت سے اسلام کی cause اور سربلندی کے لئے ہر مساعی کو لیا جانا چاہئے۔''

جیسا کہ محترم فاروقی صاحب نے لکھا کہ حدیث میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد ''غازی فی سبیل اللہ'' ہے۔ یہ ہم کیسے تسلیم کریں کہ امام ابو یوسفؒ نے ایک مسئلہ میں حدیث سے صراحت ہو جانے کے بعد اس میں قیاس یا اجتہاد کیا؟ کیونکہ امام ابو یوسفؒ کو کم از کم اتنا تو معلوم ہی ہوگا کہ اجتہاد یا قیاس ان امور میں کیا جاتا ہے جن کا علم قرآن وسنت سے صراحت کے ساتھ نہ ہو رہا ہو اور حدیث کے ہوتے ہوئے اجتہاد یا قیاس صرف اس صورت میں کیا جاتا ہے جب احادیث ہی میں ایک مسئلہ کے بارے متضاد باتیں آ رہی ہوں' تو پھر پہلے تطبیق کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے اور تطبیق بھی نہ ہو رہی ہو تو ترجیح کا اصول اپنایا جاتا ہے۔ قیاس یا اجتہاد کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حدیث پر عمل کرنا ممکن ہی نہ ہو۔ اور ظاہر ہے اس مسئلہ میں یہ سب باتیں نہیں تھیں اور پھر اُن کے استاد امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول بھی یقیناً ان کے سامنے رہا ہوگا کہ ''میری بات کے سامنے قول رسول ﷺ

پاؤ تو میری بات کو دیوار پر دے مارو''۔ رہی بات امام محمدؒ کی کہ وہ اس میں حاجیوں کو بھی شامل کرتے ہیں تو ان کے قول کی بنیاد بھی حدیث رسول ﷺ ہی ہے کہ ایک شخص نے اپنا اونٹ اللہ کی راہ میں صدقہ کیا تو اسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس پر حج کرنے والے کو سوار کرو۔ مولانا عتیق احمد قاسمی اپنی کتاب ''زکوٰۃ کے مصارف'' میں لکھتے ہیں کہ ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق متعین کرنے کے بارے میں عہد صحابہ سے لے کر سینکڑوں سال تک دو ہی رائیں رہی ہیں۔ جمہور اُمت میں ہر عہد میں ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق صرف مجاہدین کو سمجھا گیا لیکن عہد صحابہؓ سے لے کر دورِ حاضر تک تقریباً ہر عہد میں کچھ لوگ ایسے بھی رہے جنہوں نے مجاہدین کے ساتھ حاجیوں کو بھی ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق قرار دیا۔ یہی دو رائیں فی سبیل اللہ کے بارے میں مقبول و مروّج رہیں اور انہی پر اُمت مسلمہ کا اجماع ہے' یعنی تیسری کسی تفسیر کے نہ ہونے پر۔

تیسری خلافِ حقیقت بات بوجہ مغالطہ:

تحریر کے صفحہ نمبر ۳۸ پر محترم فاروقی صاحب اجتہادی رائے کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اگر امام ابو یوسفؒ نے زکوٰۃ کی رقم سے راستوں اور پلوں کی تعمیر پر خرچ کرنے کی اجازت دی ہے تو صحیح ہے''۔

امام ابو یوسفؒ سے منسوب اس بات کی وضاحت شروع ہی سے علماء احناف نے اپنی کتب میں کی ہے اور امام ابو یوسفؒ کا صحیح قول اپنی تفاسیر اور فقہی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ جیسے علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

'فی سبیل اللّٰہ' اُرید بذلک عند ابی یوسفؒ من قطع الغزوات

(روح المعانی' ج ٤' ص ١٢٣)

''امام ابو یوسف کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد قافلہ سے بچھڑے ہوئے غازی ہیں''۔

اسی طرح مولانا عتیق احمد قاسمی اپنی کتاب ''زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک'' کے صفحہ ۶۳ پر لکھتے ہیں:

''ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج میں مصارف صدقات کا بیان کرتے ہوئے ایک جملہ یہ آیا ہے:

"وسهمه فی اصلاح طرق المسلمین "(کتاب الخراج' ص ٨١)

''ایک حصہ مسلمانوں کے راستے کی مرمت کے لئے''

مگر اس جملہ کی صحت اس لئے مشتبہ ہے کہ اول تو اس میں اصلاح طرق کو ایک مستقل

سہم قرار دیا' حالانکہ قرآنی تصریح کے مطابق یہ ان آٹھ سہام سے نہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ ممکن تھا کہ اس کو فی سبیل اللہ کے عموم میں داخل فرماتے مگر خود امام یوسفؒ سے ''مبسوط سرخسی'' میں اس کے خلاف یہ منقول ہے کہ لفظ فی سبیل اللہ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے اگرچہ عام ہے اور تمام قربات اور طاعات کو شامل ہے لیکن عرف میں اس کو جہاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے آیت میں بھی وہی معنی مراد لئے جائیں گے۔ (مبسوط سرخسی' جلد ۳' صفحہ ۱۰)

چوتھی خلافِ حقیقت بات:

مندرجہ بالا بات ہی کو صفحہ نمبر ۴۸ پر محترم فاروقی صاحب نے اس طرح تحریر کیا:

''رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک کے بعد اِن الفاظ کا مصداق غازی سے بڑھا کر حاجی اور دیگر امور خیر کو بھی محیط سمجھا گیا تھا تو آج ہزار سال بعد تغیر حالات کے پیش نظر سبیل اللہ کی تشریح اور مصداق کو از سر نو کیوں متعین نہیں کیا جا سکتا''۔

گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ فی سبیل اللہ کا مصداق غازی بھی آپ ﷺ کی حدیث سے معین ہوا اور اس کا مصداق ''حاجی'' بھی آپ ﷺ کی حدیث سے سمجھا گیا۔ جبکہ دیگر امور خیر کو اس میں کبھی بھی محیط نہیں سمجھا گیا۔

اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ''آج ہزار سال بعد تغیر حالات کے پیش نظر سبیل اللہ کی تشریح اور مصداق کو از سر نو کیوں متعین نہیں کیا جا سکتا'' تو اس کا جواب قرآن پاک خود دیتا ہے۔

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدۃ: ۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

﴿وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا﴾ (النساء: ۱۱۵)

''مگر جو شخص رسولؐ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے' درآں حالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو' تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔''

پانچویں خلاف حقیقت بات:

صفحہ نمبر ۳۸ پر محترم فاروقی صاحب نے تحریر کیا کہ:

''اگر دیگر ائمہ نے ''فی سبیل اللہ'' کے مفہوم کو غزوات اور قتال سے عموم دے کر دشمن کے خلاف تیاری کے سلسلے میں تمام اقدامات کو شامل کر دیا ہے تو یہ بھی اتنا ہی درست ہے''۔

میں پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں کہ تقریباً تمام ہی ائمہ کا اس پر اجماع ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' کے مصداق مجاہدین ہیں اور کچھ کے نزدیک اس میں حاجی بھی شامل ہیں' لیکن تیسرے کسی قول کے نہ ہونے پر اجماع ہے' اور یہ ائمہ ہیں امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ امام مالکؒ امام احمد بن حنبلؒ امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ۔ دشمن کے خلاف عسکری تیاری کے حوالے سے یہ تمام ائمہ متفق ہیں' مگر اس کے علاوہ کسی اور قسم کی تیاری کے بارے میں ان فقہاء میں سے کسی کا کوئی قول موجود نہیں۔ ہمارے ایک اور ساتھی کو امام رازیؒ امام طبریؒ اور امام ابن امیرؒ کے حوالے سے مغالطہ ہو گیا ہے۔ ان کے اقوال بھی میں تحریر کر دیتا ہوں' کیونکہ ہوسکتا ہے محترم فاروقی صاحب کو بھی ان ہی کی ایک تحریر سے مغالطہ ہوا ہو۔

۱) امام رازیؒ تفسیر کبیر' ج ۱۵' ص ۱۱۳ میں اس بارے میں لکھتے ہیں:

قال المفسرون یعنی الغزوات

۲) علامہ ابن جریر طبری جامع البیان فی تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں:

واما قولہ و فی سبیل اللّٰہ فانّہ یعنی وفی النفقة فی نصرة دین اللّٰہ وطریقة وشریعة التی شرعها لعبادة بقتال اعدائه وَ ذٰلک هو غزو الکفار (ج٦' ص ١١٤)

''**واما قولہ و فی سبیل اللّٰہ**'' سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کے دین و شریعت کی نصرت میں خرچ کرنا اور شریعت کے اس راستے پر خرچ کرنا جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے مشروع فرمایا ہے اس کے دشمنوں سے قتال کی صورت میں اور یہی کفار کے ساتھ جہاد ہے''۔

۳) امام ابن اثیرؒ ''فی سبیل اللہ'' کے لغوی معنی بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ مطلقاً اس لفظ کا استعمال جہاد پر ہوتا ہے اور اس معنی میں یہ لفظ اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ اس کا مفہوم جہاد ہی مقصود ہونے لگا۔ (فقہ الزکاۃ' جلد دوم' ص ۱۲۵)

چھٹی خلاف حقیقت بات:

''ایک عمومی تاثر'' کے عنوان سے محترم فاروقی صاحب نے ایک عام دیندار اور مذہبی آدمی کے غلط تاثر کو بیان کیا ہے کہ وہ صرف مدارس ہی کو زکوٰۃ دینا صحیح سمجھتا ہے اور اس تاثر کی رو سے دوسری جگہ زکوٰۃ خرچ کرنے والے کو یہ سمجھتا ہے کہ یہ لوگ ''مَنْ شذّ شذّ فی النّار'' کے مصداق اپنے لئے جہنم کا راستہ آسان کر رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ایسا ہرگز نہیں' عام طور پر جو میرا مشاہدہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے زیادہ سے زیادہ دس فیصد لوگ ہوتے ہیں جو اِن مدارس کو زکوٰۃ دیتے ہیں' باقی تقریباً ۹۰ فیصد لوگ مختلف فلاحی اداروں' ہسپتالوں' ایدھی فاؤنڈیشن' جہادی تنظیموں' برادری کی انجمنوں یا اپنے طور پر غریب رشتہ داروں اور جاننے والوں کو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔[1] علوم دین اور علماء سے محبت رکھنے والے یقیناً کچھ دیندار اور مذہبی لوگ مدارس کے لئے زکوٰۃ کی ادائیگی کی ترغیب وتشویق دلاتے ہیں مگر ایسا ہرگز نہیں کہ وہ باقی ۹۰ فیصد زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو ''مَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ'' کا مصداق قرار دیتے ہوں۔ اس کا مصداق تو صرف انہیں سمجھا جا سکتا ہے جو قرآن وسنت کو چھوڑ کر اپنے لئے کوئی نئی راہ تلاش کریں۔

بقیہ تحریر کا تنقیدی جائزہ

صاحب مضمون کو علماء سے شکایت:

صفحہ نمبر ۲۸ کے دوسرے پیراگراف میں لکھتے ہیں:

''ہمارے عام دینی طبقے کے لوگ اور علماء بھی گزشتہ چند صدیوں کے علماء ومجتہدین کا ذکر کرتے ہیں تو ایک لفظ متاخرین کہہ کر ایک درجے میں استخفاف کرتے ہوئے اس رائے کو ناقابل التفات گردانتے ہیں' حالانکہ بدلے ہوئے حالات میں اگر رائے اور احکام بدل جائیں تو اسی کو اجتہاد کہتے ہیں''۔

اسی طرح سے صفحہ نمبر ۳۷ کے آخری پیراگراف میں لکھتے ہیں:

''اسی سلسلے میں ہمارے متاخرین فقہاء ہیں جنہوں نے حالات کے حد درجہ تغیر کی بنا پر اسلاف کی آراء سے اختلاف کیا اور مخلصانہ اجتہاد کیا' مگر عام طور پر اسے متاخرین کی رائے کہہ کر نہ صرف متاخرین کے متاخرین اس کو رد کر دیتے ہیں بلکہ اسلام کے

نوٹ: یہ اندازہ صرف میرے مشاہدے کی بنیاد پر ہے یہ تناسب کم یا زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔

اصولِ اجتہاد کی جڑ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں''۔

استخفاف کرتے ہوئے نا قابل التفات ہونے کی وجہ ''متاخرین'' یا سلف ہونا قطعاً نہیں' بلکہ ان کی رائے کا شرعی اعتبار سے مدلل نہ ہونا ہے۔ محض ''رائے'' ہمیشہ نا قابل التفات رہی ہے اور رہے گی۔ اور جو رائے (شرعی معاملے میں) قرآن وحدیث اور اجماع سے مدلل ہوگی وہ محض رائے نہ رہے گی' بلکہ اجتہاد بن جائے گی اور دینی حجت بن جائے گی۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ ان کی اپنی رائے نماز کے حوالے سے یہ تھی کہ جب تک عربی نہ سیکھ لے نماز فارسی میں پڑھ کر ادا ہو جاتی ہے' مگر ان کی یہ رائے مدلل نہ ہونے کی وجہ سے شروع دن سے نا قابل التفات رہی ہے۔

اور زیر بحث مسئلہ میں متاخرین کی رائے کو استخفاف کرتے ہوئے نا قابل التفات اس لئے جانا جا رہا ہے کہ مسئلہ شریعت کا ہے اور ان کی رائے کے حق میں کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ اور یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ مسئلہ نہ ''سلف'' ہونے کا ہے نہ ''متاخرین'' ہونے کا' بلکہ اس کے لئے تو سادہ سا اصول ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد کوئی شخص بھی اپنی ذات میں تو حجت ہے نہیں' لہٰذا کوئی بھی ہو' چاہے اس کا تعلق ائمہ اربعہ کے زمانے سے ہو یا خود ائمہ اربعہ میں سے کوئی ہو' یا آج کے دور کا کوئی عالم ہو' اگر اس کی رائے ماخذاتِ شریعت سے مدلل نہیں ہوگی' محض رائے ہوگی تو وہ رد کر دی جائے گی۔

اور صاحب تحریر نے جو یہ لکھا ہے کہ ''بدلے ہوئے حالات میں اگر رائے اور احکام بدل جائیں تو اسی کو اجتہاد کہتے ہیں'' ایسا ہرگز نہیں۔ شریعت کے جو احکام (خصوصاً تعبدی امور میں) ایک مرتبہ ثابت ہو چکے ہوں بدلے ہوئے حالات میں وہ نہیں بدلتے۔ اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے تو پھر آپ کو ان نومولود مجتہدین کی بات بھی مان لینی چاہئے جو سود کے حوالے سے اسی قسم کا اجتہاد کرتے ہیں۔

اور جنہیں صاحب تحریر یہ الزام دیتے ہیں کہ اسلام کے اصول اجتہاد کی جڑ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو بارہ بارہ چودہ چودہ سال یہی فقہ اور اجتہاد ہی پڑھتے ہیں اور یہ علماء ''اصولِ اجتہاد'' کی نہیں ایسے نومولود مجتہدین کی جڑ کاٹتے ہیں۔

زکوٰۃ کی نوعیت اور معاملات:

صفحہ نمبر ۲۶ پر ''صورت مسئلہ'' کے تحت محترم فاروقی صاحب نے لکھا:

''زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کی نوعیت اور معاملات دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ

والسلام میں کیا تھے؟ دور خلافت راشدہ میں کیا تھے؟ اور اس کے فوراً بعد جو دور آیا جس میں دور بنو امیہ اور دور بنو عباس کا ابتدائی زمانہ شامل ہے اس میں یہ معاملات اور ان پر اہل علم فقہاء امت کا نقطہ نظر کیا تھا؟ کیا ان تینوں ادوار میں یہ معاملات ہو بہو ایک جیسے رہے یا ان میں مرور زمانہ سے کوئی تبدیلی آئی؟ مزید برآں آج جو حالات.....''

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ ''زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کی ''نوعیت'' کیا تھی تو اس کے لئے عرض یہ کرنا ہے کہ :

۱) یہ ارکانِ دین میں سے ایک عبادت ہے اور ہر صاحب نصاب پر اس کا ادا کرنا فرض ہے۔

۲) زکوٰۃ کا لینا کس کو جائز ہے؟ تو قرآن وحدیث سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں جو شخص بھی اِن آٹھ مدوں کے تحت ضرورت مند ہوگا صرف انہی کو زکوٰۃ دی جائیگی۔

۳) ان مدوں میں اب کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں' کسی زمانے میں کسی مد کا محل نہ ہونے کی وجہ سے اس دور انئے کے زمانے کے لئے وہ مد' محل نہ ہونے کی وجہ سے' ساقط رہے گی۔

۴) اور ان مدوں کی تفسیر آپ ﷺ کی احادیث' تعامل صاحبہ وتابعین اور اجماع ائمہ اربعہ سے ہو جانے کے بعد اور اس اجماع پر ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد کوئی نئی تفسیر بغیر کسی دلیل وحجتِ قطعی کے شرعاً نہیں کی جاسکتی۔

یہ تو تھی زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کی ''نوعیت''۔

اب دوسری بات ''معاملات'' کے حوالے سے صاحب تحریر نے فرمائی۔ جہاں تک میں اس کو سمجھا ہوں کہ اس سے مراد کیا ہے۔

۱) زکوٰۃ کے جمع کرنے اور تقسیم کرنے کا نظام آپ ﷺ کے دور میں کیا تھا؟

۲) جن سے زکوٰۃ لی جاتی تھی ان کے حالات کیا تھے؟

۳) جنہیں زکوٰۃ دی جاتی تھی ان کے حالات کیا تھے؟

۴) وقت کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ وصول کرنے کے نظام اور ادا کرنے کے نظام میں کیا تبدیلی واقع ہوئی؟

۵) جن سے زکوٰۃ لی جاتی تھی اور جنہیں دی جاتی تھی مرور زمانہ کے ساتھ ان لوگوں کے حالات میں کیا تغیر آیا؟

غالباً انہی حوالوں سے محترم فاروقی صاحب نے ایک تاریخی جائزہ پیش کیا ہے تو اس

حوالے سے (یعنی معاملات کے حوالے سے) آپ ﷺ نے کوئی قید ویسے بھی نہیں رکھی' حالات کے مطابق زکوٰۃ کے معاملات' جیسی سہولت ہو چلائے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا اس حوالے سے تو میں محترم فاروقی صاحب سے بالکل متفق ہوں کہ ''معاملات'' کے حوالے سے اجتہاد کر کے آج کے دور کے حساب سے زکوٰۃ کے جمع کرنے اور تقسیم کرنے کا نیا نظام ہونا چاہئے۔ مگر زیر بحث مسئلہ ''نوعیت'' کے تحت آئے گا ''معاملات'' کے تحت نہیں۔

تاریخی حقائق کا جائزہ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں اموالِ زکوٰۃ کی تقسیم:

پھر صفحہ نمبر ۲۹ سے ۳۳ تک محترم فاروقی صاحب نے تاریخی حقائق کا ایک جائزہ پیش کیا۔ اس پورے جائزے میں انہوں نے اصلاً صرف ایک تبدیلی کا ذکر کیا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اموال زکوٰۃ کے حوالے سے ہوئی۔ ہمیں یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اس کا تعلق کس طرح کا بنتا ہے۔

۱) کیا حضرت عثمانؓ نے زکوٰۃ کی مدوں میں کوئی تبدیلی کی؟

۲) کیا حضرت عثمانؓ نے زکوٰۃ کی مدوں کی کوئی علیحدہ توضیح و تشریح یا تفسیر بیان کی؟

۳) زکوٰۃ ادا کرنے والوں پر زکوٰۃ کب واجب ہوتی ہے' کیا اس بارے میں کوئی تبدیلی کی؟

۴) زکوٰۃ کس طرح کے مال پر فرض ہے اور کس طرح کے مال پر فرض نہیں ہے' کیا اس میں کوئی تبدیلی کی؟

۵) کیا زکوٰۃ کی کسی مد کے محل کے ہوتے ہوئے بھی کسی مد کو ساقط کیا؟

یقیناً آپ سب کا جواب بھی اس بارے میں یہی ہوگا کہ نہیں' ایسا کچھ نہیں کیا' مگر آپؓ کے دور میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی جو تقسیم ہوئی' آخر ہم اُسے کہاں منطبق کریں گے؟ میری رائے میں یہ تبدیلی محض انتظامی نوعیت کی تھی' جس کی بنیادی وجہیں دو ہی تھیں' ایک سلطنت اسلامیہ کی وسعت اور دوسرے سوشل ویلفیئر کے عادلانہ نظام کی موجودگی' اور میرے خیال میں اس انتظامی تبدیلی سے زکوٰۃ کے کسی شرعی حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور آج کے دور میں زکوٰۃ کے جمع کرنے اور تقسیم کرنے کے نظام میں علماء سے مشورے کے بعد مزید بہتری اور اموال زکوٰۃ کی مزید تقسیم بھی کی جا سکتی ہے' جیسے بینکوں میں موجود رقم' اموال تجارت' گھروں میں موجود مال یا اور بہت سے اموال کی نئی ظاہری صورتیں جو آج کے دور میں سامنے آئی ہیں۔ واللہ اعلم!

ایک غلط تصور:

اسی ''تاریخی حقائق'' کے عنوان کے تحت (صفحہ ۳۱، جُز و ۳) کے تحت محترم فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''۳) زکوٰۃ باختلاف روایات ۵ سے ۹ ہجری کے درمیان فرض ہوئی ہے جس کے ذریعے ایک عام مسلمان کے لئے صدقات اور اللہ کے لئے قرضِ حسنہ کی ایک ناگزیر کم ازکم مقدار اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادی''۔

''صدقات'' کے حوالے سے تو محترم فاروقی صاحب کی بات صد فیصد درست ہے مگر ''قرض حسنہ'' تو اپنے نام سے بھی ظاہر ہے کہ اس کی کوئی کم ازکم حد مقرر نہیں کی جاسکتی اور سلف صالحین کی تفاسیر سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ صدقات کی تو کم ازکم حد زکوٰۃ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے مگر دینی نصرت و تائید اور قرض حسنہ کی نہ کوئی کم ازکم حد ہے اور نہ زیادہ سے زیادہ کوئی حد۔ اس کے لئے تو ہمارے پیش نظر سنت کا وہ واقعہ رہنا چاہئے جب حضور ﷺ نے ایک صحابیؓ رسول کی لائی ہوئی چند کھجوروں کو بقیہ تمام صحابہؓ کے لائے ہوئے تمام مال پر پھیلا دیا تھا اور ان کھجوروں کو تمام مال پر بھاری قرار دیا تھا۔

باب الضّلال:

صفحہ نمبر ۴۲ اور ۴۳ پر محترم فاروقی صاحب نے کیمرے کی فوٹو کے بارے میں عالم عرب اور پاک و ہند و بنگلہ دیش کے طرزِ عمل کی تمثیل بیان کی ہے اور صفحہ ۴۳ پر رقم طراز ہیں کہ

''اب عملاً خلاف ورزی وہاں بھی ہے اور یہاں بھی اور نتیجہ دونوں آراء کا ایک ہی ہے، لیکن ہمارے ہاں کا عام مسلمان ذہنی خلفشار میں رہتا ہے اور وہاں کا مسلمان ذہنی سکون میں۔ یہی کیفیت ہوگی اس جواز کے فتویٰ کے بعد کہ موجودہ حیلہ کے طریق پر عمل درآمد سے بہرصورت اہلِ تقویٰ کے دل میں اضطراب کی کیفیت رہتی ہے جبکہ فتویٰ کے بعد زکوٰۃ کی رقم کا استعمال تو بہرحال وہی ضروریاتِ دینی ہی ہوں گی مگر اضطراب قلبی سے نجات ضرور میسر آجائے گی، اور یہ بہت بڑا فرق ہے''۔

محترم فاروقی صاحب کا یہ فلسفہ بھی محلِ نظر ہے۔ تحریر کے اس حصّہ سے (فوٹو کے جائز یا ناجائز ہونے سے قطع نظر) جو میں سمجھا ہوں کہ جس گناہ کے کرنے میں اضطراب یا خلش محسوس ہو اُسے گناہ ہی نہ رہنے دو، بلکہ جائز کردو تاکہ دل کی خلش بے چین ہی نہ کرے۔

میرے خیال میں تو کوئی حق گو مفتی ''ضمیر کی خلش یا اضطراب'' کو علت مان کر فتویٰ دے گا نہیں۔ ہاں! یورپ میں ایسے مفتی کثرت سے مل جائیں گے۔ کیوں کہ اہل یورپ نے Prostitution کو اسی فلسفہ کے تحت قانونی شکل دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ فطری تقاضا ہے اور لوگ ناجائز طریقے سے اس جنسی تقاضے کو پورا کرتے ہیں' مگر ایک احساس گناہ بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے شخصیت متاثر ہوتی ہے' شخصی کردار میں کمزوری پیدا ہوتی ہے اور شخصیت صحیح طور سے پروان نہیں چڑھتی۔ چنانچہ انہوں نے اسے قانونی شکل دے دی' لہٰذا اب وہاں یہ سب کرتے ہوئے کسی کو ضمیر کی خلش نہیں ہوتی اور نہ دل مضطرب ہوتا ہے۔ لہٰذا اب اس فلسفہ کی رو سے جب بھی کسی گناہ کی خلش کسی کو ستائے تو وہ یورپ کے مفتیوں سے اس کو جائز کروالے' کیوں کہ یہاں تو تا حال ایسے ممکن نہیں۔

صاحب تحریر کا علماء اور مفتیان عظام کو مشورہ:

محترم فاروقی صاحب نے صفحہ نمبر ۲۵ پر موجود ظروف و احوال میں علماء دین متین اور مفتیان عظام کو مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ وہ:

> ''صرف مفتیٰ بہ قول (اور وہ بھی ''مُلکاً عَاضًا'' کے دور کا) نقل کر کے بھیج دینے کو کافی نہ سمجھیں تو مجھے اللہ تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ وہ بھی اسی رائے تک پہنچیں گے کہ موجودہ دَور کے دین سے دُور عوام کے مسائل کو حکومتوں کے بے پناہ وسائل پر چھوڑ کر ''صدقات'' کی اس آمدنی کو اسلام کی بقا اور نشاۃِ ثانیہ کے لئے کام کرنے والے اداروں اور ان سے وابستہ اور ملحق افراد کی ضروریات کی کفالت تک محدود کر دینا چاہئے۔''

محترم فاروقی صاحب نے علماء دین متین و مفتیان عظام سے جو درخواست کی ہے میرے خیال میں تو یہ بے سود ہے۔ ہاں! اگر رسول اللہ ﷺ آج حیات ہوتے تو اس درخواست کا ان کے سامنے پیش کیا جانا حق بجانب تھا۔ ان علماء دین اور مفتیان عظام کو تو اس چیز کا اختیار ہی نہیں۔ رہی بات مفتیٰ بہ قول یا فتویٰ کی' تو اس سے مراد سائل کی یہ ہوتی ہے کہ مفتی یا عالم سائل کو اس کے پیش کردہ ظروف و احوال کے مطابق شریعت کا صحیح حکم بتائے اور شرعی حکم مدلل ہوتا ہے قرآن' حدیث' اجماع اور قیاس سے' اگر شرعی حکم ان سے ثابت ہو جاتا ہے تو پھر خواہ حالات کیسے بھی ہوں کسی کو بھی اختیار نہیں کہ وہ ان سے ہٹ کر شریعت کے متوازی اپنی کوئی رائے دے اِلّا یہ کہ شریعت نے ہی کوئی رعایت دی ہو۔ اس وقت تو باطل پوری کوشش میں ہے کہ مسلمان اپنی بنیادوں سے ہٹ کر دین کی نئی نئی تشریحات ان کی مرضی

کے مطابق کریں اور اس طرح اپنے مقاصد کو اعلیٰ روح کے ساتھ حاصل نہ کر سکیں۔

ایک اور مشورہ:

اسی صفحہ ۲۵ کی آخری سطر میں محترم فاروقی صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''اور جب تک علمائے حق اس بات پر متفق نہ ہوں کہ غرباء اور مساکین عوام کے لئے تو شاید امریکہ اور دجال کی طرف سے امداد آجائے' اور آرہی ہے' دین متین کی حفاظت اور احیائے دین کے لئے کوششیں جو بالآخر جہاد و قتال کے مرحلے میں داخل ہو کر اسلام کو ایک عالمی خلافت کی شکل دے سکتی ہیں' اس کے لئے یہی محدود وسائل اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و اعانت کے علاوہ کچھ بھی میسر نہیں''۔

علماء حق کو جس بات پر متفق ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے' کیونکہ اتنا تو ایک سیکولر سے سیکولر شخص بھی سمجھتا ہے کہ امریکہ اور دجال کو مسلمانوں کی غربت اور فقر سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ آج تک امریکہ اور دجال کی امداد سے کسی غریب اور مسکین کی غربت دور ہوئی۔ ان کی تو تمام پالیسیاں مسلمانوں کو مزید غریب بنانے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔

اور فاروقی صاحب کا آخری جملہ:

''اس کے لئے یہی محدود وسائل اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و اعانت کے علاوہ کچھ بھی میسر نہیں''۔

میں سمجھتا ہوں کہ مندرجہ بالا جملہ تو ہماری ناشکری اور نا امیدی کا مظہر نظر آتا ہے۔ محمد ﷺ نے ساری جدوجہد کیا اسی مدد کے بل بوتے پر کی تھی؟ اور کہاں ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اُسوہ؟ کیا انہوں نے اسی مدد پر بھروسہ کر کے اقامت دین کا کام کیا تھا؟ میرے لئے تو یہ سوچنا بھی میری تحریکی موت کے مترادف ہے۔

مادہ پرست معاشرے کے اثرات:

''تطبیق'' کے عنوان سے محترم مختار حسین فاروقی صاحب نے صفحہ نمبر ۴۲ کے دوسرے پیراگراف میں تحریر کیا:

''اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے تو یو۔این۔او' امریکہ اور تمام حکومتیں اور این جی اوز کر ہی رہی ہیں۔ جس مقصد کے لئے کہیں سے امداد کی موہوم (remote) توقع بھی نہیں ہے وہ اسلام کی حفاظت و

سربلندی کا مقصد ہے' لہٰذا یہ صحیح اور برمحل بات ہے کہ' اسلام ہی اس دور میں سب سے زیادہ یتیم ہے۔''

مندرجہ بالا سطور کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی مادہ پرستانہ فکر نے نہ صرف عام لوگوں کو متاثر کیا بلکہ اچھے خاصے دینی فہم رکھنے والے بھی اس سے محفوظ و مامون نہ رہ سکے۔ ان سطور پر غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا سارا انحصار اسباب و وسائل پر ہے اور اللہ کی ذات کہیں پس منظر میں چلی گئی ہے یا اللہ تعالیٰ کے پاس بھی (معاذ اللہ) محدود وسائل ہیں' لہٰذا غریبوں اور مسکینوں کو تو مغربی این جی اوز کے حوالے کر دیا جائے تا کہ ہمارے وسائل میں کمی نہ آنے پائے۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

جبکہ ایک عام آدمی بھی این جی اوز اور اقوام متحدہ کے مذموم مقاصد سے واقف ہے۔

''الخلق عیال اللّٰہ'' کے مصداق اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اپنی تمام مخلوق کا رازق ہے اور اس نے بھی مسلمانوں کے لئے ایک این جی او بنائی ہے جس کا رکن ہر مسلمان ہے اور وہ اپنے حلال مال سے ایسے ضرورت مندوں کے لئے ڈھائی فیصد رقم نکالتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ہی اللہ تعالیٰ کی اس این جی او کے دفتر پر تالا مارنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

تنظیم اسلامی کی فکر سے متصادم:

اور رہی فاروقی صاحب کی یہ بات کہ ''اسلام ہی اس دور میں سب سے زیادہ یتیم ہے'' اسلام اللہ کا دین ہے اور اس دین کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے۔ یہ ''دین اللہ'' ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ دین یتیم ہو گیا ہے' یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب اس کی پرورش اور اس کو لازماً قائم کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ میرے خیال میں تو یہ سوچ تکبر کو جنم دینے والی سوچ ہے اور بانی تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دینی فکر سے متصادم ہے۔ بانی تنظیم محترم ڈاکٹر صاحب نے تو اپنے دروس و تقاریر میں یہی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے' وہ چاہے تو ایک آن میں سب مسلمان ہو جائیں اور دین قائم ہو جائے.....اور وہ کر کے بھی رہے گا' جیسا کہ اس نے فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ﴾ مگر اللہ تعالیٰ ہماری آزمائش کرنا چاہتا ہے کہ کون اس کے دین کو قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اور

اپنا مال اور اپنی جان کھپاتا ہے (شریعت کی پابندی کرتے ہوئے)۔ ''اقامت دین'' تو ایک ذریعہ ہے' اصل مقصود تو رضائے الٰہی ہے۔ غلبہ دین تو اللہ تعالیٰ ہی کریں گے اور جب چاہیں گے کریں گے۔ بانی محترم فرماتے ہیں تم تو بس اللہ کے لئے اس کام میں اپنے آپ کو لگا دو' کھپا دو اور نحن انصار اللّٰہ کا نعرہ بلند کرو۔ مگر ہرگز اپنے آپ کو اس کام کا ٹھیکیدار نہ سمجھنا چاہئے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اور نہ ہی اس کے رسول ﷺ نے کہیں فرمایا کہ تم اس دین کے ٹھیکیدار بن جاؤ' اب تمہیں ہر حال میں اس دین کی عمارت قائم کرنی ہی ہے' اور اگر اس کے لئے تمہارے پاس جائز وسائل نہ ہوں تو ناجائز طریقے سے بھی وسائل لازماً حاصل کرو۔

تنظیم اسلامی کی فکر جو میں سمجھا ہوں اور امیر تنظیم کے ابتدائی امارت کے زمانے کی تقاریر میں بھی بنیادی تلقین یہی تھی کہ رضاءِ الٰہی اصل مقصود ہے۔ ہاں رضاءِ الٰہی مکمل طور سے حاصل اقامت دین کی جدوجہد کے ذریعے ہی ہوتی ہے مگر اپنے جائز اسباب و وسائل کے ساتھ' شریعت کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے' اتباع رسول ﷺ کرتے ہوئے۔ اگر کہیں یہ فکر پس منظر میں چلی گئی اور اقامت دین کو اپنے اوپر مسلط کر لیا تو پھر ساری توانائیاں' صلاحیتیں اور وقت' اقامت دین کے لئے ضروری اسباب و وسائل ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرنے میں صرف ہو جائیں گے اور یوں ہم خود اپنی منزل سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ و مامون رکھے (آمین)

بقیہ: مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

''اور وہ وقت یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلتا رہوں گا یہاں تک کہ اس مقام پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملتے ہیں یا یوں ہی زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا۔''

ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہے' اس لئے تعلیم دراصل عمر بھر کا مشغلہ ہے۔ اس کے لئے کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ عمر کی کوئی شرط نہیں ہے۔ ''انسان کا فرض ہے کہ وہ مہد سے لحد تک علم حاصل کرے''۔ یہ ہے تحصیل علم اور تدریس کا وہ طریقہ جس کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کو توحید کی تعلیم دی۔

بحالاتِ موجودہ ''شیعہ سنی مفاہمت'' واقعتاً ناگزیر ہے!

گوجر خان سے ایک فکر انگیز خط

محترمی و مکرمی بانی و مؤسس تنظیم اسلامی
و جناب حافظ عاکف سعید صاحب امیر تنظیم اسلامی پاکستان!

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ''شیعہ سنی مفاہمت کی ضرورت و اہمیت'' نامی کتابچہ وہ ارفع و فہمیدہ طرزِ تحریر اور تجویز ہے جو موجودہ دور میں احیائے دین کی محرک ہے' ایک ایسا عظیم الشان محرک جو انقلابی طرزِ فکر اور صحیح العقیدہ بلکہ راسخ العقیدہ لوگوں کی روش ہے۔ احیائے دین کے سلسلہ میں ایسی شہرۂ آفاق اور عمل انگیز تحریر کو وسیع و کثیر الاشاعت روزناموں میں ضرور جگہ دلوانی چاہئے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کا اہتمام کرنا آج کے دور میں شاید سب سے بڑی نیکی ہے جس کا اجر بھی اسی کی طرح کثیر الجہتی ہوگا' ان شاء اللہ' اور اسی کی ہمیں اللہ عزوجل سے امید رکھنی چاہئے۔

جوں جوں وقت الٹی گنتی گن رہا ہے توں توں خطہ کے اندر نظر آنے والے طوفانوں کے آثار تیزی سے نمایاں ہو رہے ہیں۔ ہمارے کئی دانشوروں نے عراق کی تقسیم کے حوالے سے وہاں فرقہ وارانہ تقسیم (شیعہ اور سنی) کا انذار و تبشیر شروع کر دیا تھا اور یہ بھی forecast کر دیا تھا کہ ایک Dialectic Process معاشرتی ردِّعمل کی شکل میں آ سکتا ہے۔ اب ایسا ہی forecast پاکستان اور ایران کے حوالے سے کیا جا رہا ہے۔ خطہ میں ایک بڑی شیعہ اسلامی ریاست کی موجودگی کے پیشِ نظر پاکستان میں' جہاں کے عوام آپ کی طرف متوجہ ہیں' رجوع کر رہے ہیں' فرقہ واریت کے حوالے سے شیعہ سنی عوام کو حقائق سے مکمل طور پر خبردار کر دینا اور انہیں آنے والے شدید خطرے کا شد و مد سے احساس دلانا ایک دینی فرض ہے۔

ہیکل سلیمانی کے بلیو پرنٹ تیار ہو چکے ہیں۔ Temple of Doom دنیا میں معرکۂ کفر و اسلام کا موجب ہوگا۔ ایسے میں امریکہ کے جنوبی ایشیا میں خطرناک عزائم ہیں۔ ایسے

میں اگر شیعہ سنی اختلاف جو صدیوں پر محیط ہے اس کا حل اور پاکستان کے آئندہ اسلامی سیٹ اپ کا تعین نہ کیا گیا تو ہمیں مزید کوڑوں اور عذاب کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ عیاشیوں اور بے فکری میں ڈوبی ہوئی یہ قوم ازخود اجتماعی توبہ کی طرف شاید ہی مائل ہو کیونکہ مشہور ہے کہ جب روم جل رہا تھا تو نیرو بانسری بجا رہا تھا۔

مزید یہ کہ ہمارے اعمال خواہ کتنے ہی اسفل کیوں نہ ہو چکے ہوں ابھی تک ایک جلتی ہوئی چنگاری راکھ کے ڈھیر تلے سانس لے رہی ہے۔ یہ چنگاری شعلے میں تبھی بدل سکتی ہے جب نئی نسل کو ''تقابلِ ادیان'' (Comparative Study of Religions) کی طرف ملتفتِ عمل کر دیا جائے۔ آپ کے اکثر خطابات میں علم کے دو حصوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ علم کی ان دونوں آنکھوں کا بیک وقت کھلنا ضروری ہے۔ یہ مسلمان ہی تھے جو جدید سائنس کے آباء واَجداد ہیں۔ ہمارے سابقہ ادوار میں Scientific Studies کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ انگریزی زبان تبلیغ واشاعت کے لئے آج کل کے دور میں جس قدر مؤثر ثابت ہو رہی ہے آج سے پہلے شاید کبھی نہ تھی۔ Qtv پر ڈاکٹر سید ذاکر نائیک' یوسف اسٹیو اور محترم بانی وصدر مؤسس جیسی شخصیات اور اے آر وائی پر ڈاکٹر شاہد مسعود کے End of Times کے پانچ شہرۂ آفاق تہلکہ خیز پروگراموں نے دل جیت لئے ہیں اور اپنا حق ادا کر دیا ہے' لیکن ابھی مزید محنت اور کام باقی ہے۔ ایسے اداروں کا وجود میں لایا جانا ضروری ہو چکا ہے جو فرقہ واریت کے اس ایک عشرہ سے زیادہ عمیق اختلافات' تنازعات اور مآخذ کے جھگڑوں پر ایک جامع ریسرچ کریں' حقائق مبرہن کریں' اور اہم بات یہ ہے کہ ''شیعہ سنی مفاہمت'' طرز کی زیادہ سے زیادہ تحریریں کثیر الاشاعت مؤقر جریدوں میں شائع کروائی جائیں تاکہ عوام پر ہماری بات واضح ہو سکے۔

میں ذاتی طور پر تنظیم اسلامی کو بانی وامیر کی نظریاتی اساسات پر استوار ہوتا دیکھ رہا ہوں۔ نیز ہمیں مسلکی جھنجھٹ سے بھی جان چھڑانی ہوگی۔ ہمیں مسلکی تقابل کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرتے ہوئے acquired اور revealed علم کی تہہ میں جانا ہوگا اور ''تقابل ادیان'' پر بھی گہری نظر رکھنی ہوگی۔ والسلام

وفا شعار

عدنان شہزاد (گوجر خان)

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : شرح دیباچہ مثنوی مولانا رومؒ المعروف رسالہ نائیہ
مصنف : مولانا یعقوب چرخیؒ (م ۸۵۱ھ)
مترجم : محمد نذیر رانجھا
ضخامت: 176 صفحات ..... قیمت :110 روپے
ناشر: جمعیۃ پبلیکیشنز، متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ لاہور

مثنوی مولانا روم فارسی نظم میں لکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب ہے۔ مولانا رومؒ باطنی علوم سے مالا مال تھے۔ مثنوی آپ کی شاہکار تصنیف ہے جس کو حد درجہ پذیرائی ملی۔ یہ کتاب عالمگیر شہرت کی حامل ہے اور اخلاقیات اور تصوف کے موضوع پر صف اوّل کی کتب میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں مولانا نے حکایات قلمبند کی ہیں جو نہایت سبق آموز اور مؤثر ہیں۔ کئی جگہ پر یہ کتاب سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی ہے اور بعض جگہ نامی گرامی علماء اس کا درس بھی دیتے ہیں۔

مثنوی مولانا رومؒ کا دیباچہ خود ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ اس کی شرح مولانا یعقوب چرخیؒ نے لکھی جو تقویٰ شعار صوفی بزرگ تھے۔ مولانا چرخی کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں شرح اسماء الحسنیٰ اور تفسیر یعقوب چرخی بھی شامل ہے۔ شرح دیباچہ مثنوی مولانا روم المعروف رسالہ نائیہ کا اردو ترجمہ محمد نذیر رانجھا صاحب نے کیا ہے جو خود کئی کتابوں کے مصنف اور ماہر مترجم ہیں۔ ترجمہ اس مہارت سے کرتے ہیں کہ کتاب طبعزاد معلوم ہوتی ہے۔ پھر انہوں نے اس کتاب کے آغاز میں مقدمہ اور حواشی کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔

مولانا رومؒ نے علم و حکمت کے حصول کے لئے طویل سفر کئے اور تصوف و سلوک کی کٹھن منازل طے کیں۔ یہ کتاب ان کی قلبی واردات، مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ ہے۔

تصوف کے سفر میں شرعی حدود کی پاسداری انتہائی مشکل کام ہے جس میں بڑے بڑوں سے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۰ پر حدیث کے الفاظ لکھے ہیں جس کا ترجمہ صفحہ ۴۴ پر ان الفاظ میں ہے: ''جب تم اہل صدق کی صحبت میں بیٹھو تو اُن کے پاس صدق سے بیٹھو' کیونکہ وہ دلوں کے بھید جانتے ہیں۔ وہ تمہارے دلوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور تمہارے ارادوں اور نیتوں کو دیکھ لیتے ہیں''۔ یہ الفاظ یقیناً غیر محتاط ہیں۔ پھر حوالہ نہیں دیا گیا کہ یہ حدیث کس مجموعۂ حدیث سے لی گئی ہے۔ دین کی خدمت اور عوام الناس کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تشہیر کی جائے اور مشتبہ چیزوں سے احتراز کیا جائے۔

کتاب کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ معیاری ہے۔ جلد مضبوط اور ٹائٹل خوشنما ہے۔ البتہ قیمت کچھ زیادہ لگتی ہے۔

(۲)

نام کتاب : اسلام میں تصور جہاد (اور دورِ حاضر میں عملِ جہاد)

مصنف : حافظ مبشر حسین لاہوری

ضخامت: 477 صفحات ..... قیمت :160 روپے

ملنے کا پتہ: نعمانی کتب خانہ' حق سٹریٹ' اردو بازار لاہور

حافظ مبشر حسین کئی کتابوں کے مصنف اور معروف اہل علم وقلم ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کو واضح کرنے کے لئے تحقیق وجستجو کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''اسلام میں تصور جہاد'' بھی جہاد کے موضوع پر ایک مکمل اور جامع کتاب ہے جو درج ذیل سات ابواب پر مشتمل ہے۔

۱) شرعی اصطلاح میں جہاد کس کو کہتے ہیں؟
۲) جہاد کی فرضیت
۳) جہاد' سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں
۴) جہاد کی بنیادی صورتیں اور ان کے آداب وضوابط
۵) تاریخ جہاد
۶) دورِ حاضر کی عالمی سیاست اور مسلم قومی ریاستیں

۷) دورِ حاضر میں عالم اسلام اپنا دفاع اور جہاد کیسے کرے؟

ہر باب میں کئی فصلیں ہیں اور ہر فصل ایک اہم موضوع ہے۔ جہاد ایک مقدس لفظ ہے۔ قرآن مجید اور احادیث رسولؐ میں اس کا ذکر کثرت کے ساتھ موجود ہے' مگر آج کے دَور میں مسلمانوں کی ایمانی' عملی اور مادی کمزوری نے اس لفظ کے تقدس کو ختم کر دیا ہے۔ مصنف نے مختلف ضمنی موضوعات کو زیر بحث لا کر تمام قسم کے شکوک وشبہات کو دُور کر کے جہاد کی صحیح صورت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ جہاد ایک مقدس فریضہ ہے جو ہر مسلمان کی ذاتی زندگی اور مسلمان معاشرہ دونوں میں ہمہ وقت جاری وساری رہنے والا عمل ہے اور اس میں کسی اعتبار سے بھی ظلم وزیادتی کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ مسلمان تو ہمیشہ سے امن پسند اور سلامتی کے خواہاں ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف اس موضوع پر جامع ومانع معلومات فراہم کرے گا بلکہ عمل جہاد کی مختلف توجیہات کے ضمن میں لوگوں میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کا بھی ازالہ کرے گا۔ جہاد کے بارے میں کسی بھی قسم کا شبہ اِس کے پڑھنے سے دُور ہو جائے گا اور اس ضمن میں ذہن میں اٹھنے والے ہر سوال کا تسلی بخش جواب بھی مل جائے گا۔

کتاب کا ٹائٹل خوبصورت اور جلد مضبوط ہے۔ کمپوزنگ کی اغلاط کہیں کہیں موجود ہیں۔ کتاب پر قیمت درج نہیں۔

(۳)

نام کتاب : ہدیۃ العروس

مصنف : حافظ مبشر حسین لاہوری

ضخامت:600 صفحات ..... قیمت :210روپے

ملنے کا پتہ:نعمانی کتب خانہ' حق سٹریٹ' اردو بازار لاہور

''ہدیۃ العروس'' ایک معلومات افزا کتاب ہے جس میں ازدواجی وخانگی زندگی کے احکام و مسائل بڑی تفصیل سے درج کئے گئے ہیں۔ حافظ مبشر حسین لاہوری معروف مصنف ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ انہوں نے کچھ اور کتب بھی لکھی ہیں جو شائع ہو چکی ہیں' مثلاً پیشین گوئیوں کی حقیقت' اسلام میں تصور جہاد' جہاد اور دہشت گردی' قیامت کی نشانیاں اور کتاب الدعاء وغیرہ۔

فاضل مصنف تحقیق کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ یہ بات ''ہدیۃ العروس'' کے مطالعہ سے کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ازدواجی اور خانگی زندگی کے متعلق یہ ایک جامع تصنیف ہے۔ مصنف نے اس عنوان کے تحت آنے والے کسی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ یہ کتاب درج ذیل بارہ ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب:	شادی کی ضرورت واہمیت اور ترکِ شادی کے نقصانات
دوسرا باب:	شادی بیاہ کا اسلامی طریقہ' انتخاب رشتہ سے ولیمہ تک
تیسرا باب:	شادی بیاہ کی جاہلانہ رسومات اور اسلام
چوتھا باب:	زوجین' نومولود اور سسرال کے حقوق وفرائض
پانچواں باب:	حرام' فاسد اور باطل نکاح
چھٹا باب:	طلاق اور عدت سے متعلقہ مسائل واحکام
ساتواں باب:	نکاح سے متعلقہ چند متفرق اور پیچیدہ مسائل
آٹھواں باب:	ظہار' ایلاء اور لعان کے مسائل واحکام
نواں باب:	میاں بیوی سے متعلقہ چند خاص مسائل
دسواں باب:	تعدد ازدواج
گیارھواں باب:	اسلام اور ضبط ولادت
بارھواں باب:	آسان گھریلو ٹوٹکے اور آزمودہ نسخے

ہر باب میں کئی کئی فصلیں ہیں اور ہر فصل باب کے تحت آنے والے ذیلی عنوانات پر روشنی ڈالتی ہے۔ کتاب ازدواجی اور خانگی زندگی میں پیش آنے والے تمام مسائل پر جامع راہنمائی فراہم کرتی ہے۔ شادی شدہ مرد وزن کے لئے یہ پڑھنے کی چیز ہے یا پھر جن کی شادی عنقریب ہورہی ہو۔ البتہ ناپختہ عمر کے بچے بچیوں سے یہ کتاب دور رکھنا ضروری ہے۔

کتاب کا ٹائٹل خوبصورت' دیدہ زیب اور پرکشش ہے۔ جلد مضبوط' کاغذ سفید اور اچھی قسم کا ہے۔ البتہ کمپوزنگ کی اغلاط جابجا ہیں' اگلے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ضروری ہے۔

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' مزید برآں 44 آڈیو کیسٹس کے سیٹ کی صورت میں اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی اعانتی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I,II,III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرت پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501